ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں "بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر" کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

جو کئی سال سے آؤٹ آف پرنٹ تھی'

اب اس کتاب کا نیا نظر ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن نئی آب و تاب کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہو کر آ چکا ہے' جس میں مندرجہ ذیل نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے :

- فکر اقبال کی روشنی میں حالات حاضرہ کا جائزہ اور ہماری ذمہ داریاں

از قلم : ڈاکٹر اسرار احمد

- حیات و سیرت اقبال
- فلسفہ اقبال
- ملت اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام

از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

- اقبال اور قرآن' از قلم : سید نذیر نیازی

عمدہ کتابت' دیدہ زیب طباعت' صفحات ۱۴۴

قیمت : اشاعت خاص (سفید کاغذ' پائیدار و خوبصورت جلد) ۷۲ روپے

اشاعت عام (نیوز پیپر ایڈیشن) ۳۰ روپے

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' ۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۱۹ | صفر المظفر ۱۴۲۱ھ — مئی ۲۰۰۰ء | شمارہ ۵

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱-داؤد منزل متصل شادی گری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اوّل

پاکستان ایک فیصلہ کن دوراہے پر

اس اہم موضوع پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ایک حالیہ خطاب جمعہ کی تلخیص ذیل میں ہدیۂ قارئین کی جارہی ہے :

"صدر کلنٹن کے دورۂ جنوبی ایشیا کے بعد پاکستان ایک فیصلہ کن دوراہے پر آ کھڑا ہوا ہے۔ اب پاکستان کو امریکہ کی ڈکٹیشن پر عمل کرتے ہوئے بھارت کے تابع مہمل بن کر ذلت کی زندگی گزارنے یا پاکستان کے قیام کی نظریاتی اساس یعنی "اسلام" سے سچی وابستگی کے باوقار راستے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔ روس کے ٹکڑے ہونے کے بعد امریکہ اور اس کے مغربی اتحادیوں کے لئے اس خطے میں پاکستان کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا امریکی صدر نے اپنی تقریر میں جو نصیحت کی ہے اس کے بین السطور اصل پیغام یہ ہے کہ :

۱) ہم اپنی نظریاتی اساس سے وابستگی ختم کردیں۔

۲) مکمل طور پر مغربی جمہوری نظام کو اختیار کرلیں۔ جس کا دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا فیصلہ اور توہین رسالتؐ کا قانون ختم کیا جائے۔

۳) کشمیر کو بھول جائیں' بھارت اگر لائن آف کنٹرول کو مستقل سرحد مان لے تو بھی غنیمت جانیں۔

۴) ہم اپنا نیوکلیئر پروگرام رول بیک کردیں۔

۵) جہادی تنظیموں پر پابندی عائد کردیں۔

۶) دینی مدارس کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کردیا جائے۔

۷) طالبان سے روابط ختم کردیئے جائیں۔

۸) ورلڈ بینک' آئی ایم ایف اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے جملہ احکام بسرو چشم بجالائیں اور عوام کا خون نچوڑ کر ان کے مطالبات پورے کئے جائیں۔

۹) بھارت کو علاقائی سپرپاور تسلیم کرلیا جائے۔ (باقی ٹائٹل کے اندرونی صفحہ ۳ پر)

دروس ۱۶

جہاد فی سبیل اللہ کی غایت اولیٰ شہادت علی الناس

سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں

(۲)

مطالباتِ دین کا خلاصہ

اَحْمَدُہٗ وَاُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

سورۃ الحج کے آخری رکوع کا جزوِ ثانی جو دعوتِ عمل پر مشتمل ہے' یا جس میں یوں کہنا چاہئے کہ ایمان کے عملی مقتضیات کا بیان ہوا ہے کہ ایک بندۂ مؤمن سے اس کا دین کیا تقاضا کرتا ہے' دو آیات پر مشتمل ہے :

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ○ وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ؕ ھُوَ اجْتَبٰکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ ؕ ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ھُوَ مَوْلٰکُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ○ ﴾

"اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور بندگی کرو اپنے رب کی اور بھلے کام کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور جہاد کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اس کے لئے جہاد کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں چن لیا ہے اور تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کے طریقے پر۔ اس نے تمہارا نام رکھا مسلمان' پہلے بھی اور اس میں بھی' تاکہ ہو جائیں رسول (ﷺ) گواہ تم پر اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر۔ پس قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اللہ سے چمٹ جاؤ۔ وہی ہے تمہارا پشت پناہ۔ تو کیا ہی اچھا ہے پشت پناہ اور کیا ہی عمدہ ہے مددگار!"

یہ دو آیات ہیں جن میں ایمان کے مقتضیات کو نہایت جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ پہلی آیت نسبتاً چھوٹی ہے' دوسری طویل' بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید کی طویل ترین آیات میں سے ہے تو غالباً غلط نہ ہو گا۔ ان آیات میں' جیسا کہ آپ نے نوٹ کیا ہو گا' پے بہ پے فعل امر وارد ہوئے ہیں کہ یہ کرو اور یہ کرو اور یہ کرو۔ حکمت قرآنی کا یہ اصول پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسلام کی دعوت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے' ایک ہے دعوتِ ایمان جو عام ہے پوری نوع انسانی کیلئے' ہر فردِ نوعِ بشر کیلئے' اور دوسری ہے دعوتِ عمل۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے مخاطب صرف وہی ہو سکتے ہیں کہ جو ایمان کا اقرار کر چکے ہوں' جو دعویٰ کرتے ہوں اللہ کو ماننے کا' آخرت کو ماننے کا اور نبوت و رسالت کو ماننے کا۔ ایسے ہی لوگوں سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اب ایمان کے ان عملی تقاضوں کو پورا کرو! اس ضمن میں یہاں جو چند الفاظ وارد ہوئے ہیں اگر نگاہ کو صرف ان کے ظاہر تک محدود نہ رکھا جائے' بلکہ کسی قدر گہرائی میں اتر کر غور کیا جائے' تو مطالباتِ دین اور دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں ایک بڑا عمدہ نقشہ سامنے آتا ہے جسے اگر ایک سیڑھی سے مشابہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ جیسے ایک منبر کے قدمچے (Steps) ہوتے ہیں جن پر قدم رکھ کر انسان درجہ بدرجہ اوپر چڑھتا ہے' اسی طرح مقتضیاتِ دین یا دین کے عملی مطالبات کا تدریجاً اور سلسلہ وار بیان ان دو آیتوں میں آیا ہے۔

پہلی سیڑھی : ارکانِ اسلام

فرمایا : ﴿ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾ "رکوع کرو اور سجدہ کرو!" قرآن مجید میں اکثر و

بیشتر آپ دیکھیں گے کہ نماز کے مختلف ارکان کا ذکر ہوتا ہے' لیکن ان سے نماز مُراد لی جاتی ہے۔ جیسے سورۃ المزمل میں فرمایا گیا : ﴿ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ "کھڑے رہا کرو رات کو سوائے اس کے کچھ حصے کے۔" اب ظاہر بات ہے کہ کھڑے ہونے سے یہاں نماز میں کھڑے ہونا مُراد ہے۔ اسی طرح سورۃ الدھر کی آیت ہے : ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴾ "اور رات کے ایک حصّے میں اللہ کے سامنے سربسجود رہا کرو اور تسبیح کیا کرو!" یہاں تسبیح اور سجدہ سے مُراد درحقیقت نماز ہی ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج کی اس زیر نظر آیۂ مبارکہ میں بھی رکوع اور سجود سے مُراد نماز ہے۔ اور نماز درحقیقت ارکانِ اسلام میں رُکن رکین ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ارکانِ اسلام میں سے پہلا رکن کلمۂ شہادت ہے' لیکن وہ آپ سے آپ یہاں گویا understood ہے' اس لئے کہ جب گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کے الفاظ سے تو سیدھی سی بات ہے کہ وہی لوگ یہاں مخاطب ہیں جو کلمۂ شہادت ادا کر چکے ہیں۔ اس کے بعد ارکانِ اسلام میں سے اہم ترین رکن بلاشبہ نماز ہے' جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا :

﴿ بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ تَرْكُ الصَّلَاةِ ﴾ (صحیح مسلم)

"کفر و شرک اور بندے کے درمیان نماز کا معاملہ حائل ہے"۔

لہٰذا اولاً اسی کا حوالہ دیا گیا کہ نماز قائم کرو۔ گویا نماز کی حیثیت تمام ارکانِ اسلام میں نمائندہ رکن کی ہے اور اس کے ذیل میں زکوٰۃ' روزہ اور حج آپ سے آپ مندرج ہیں' خواہ لفظاً وہ مذکور نہ ہوں۔ یہ حقیقت اگلی آیت کے آخر میں جا کر کھل جائے گی کہ یہاں رکوع و سجود سے مُراد صرف نماز نہیں بلکہ تمام ارکانِ اسلام مُراد ہیں۔ بہرحال یہ بات بالکل منطقی ہے اور سمجھ میں آنے والی ہے کہ جو شخص ایمان کا اقرار کرتا ہے اُس پر سب سے پہلی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ارکانِ اسلام کی پابندی کرے۔ یہ پہلی سیڑھی ہے۔ اس پر قدم جماؤ تب دوسری سیڑھی کی طرف بڑھو!

دوسری سیڑھی : بندگیٔ رب

وہ دوسری سیڑھی کیا ہے! ﴿ وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ﴾ "اپنے رب کی بندگی کرو!" یعنی اس کے عبد اور غلام بن کر زندگی بسر کرو! اس (تعالیٰ) کو اپنا آقا سمجھو اور اپنے آپ کو اُس کا مملوک جانو! اپنے کل وجود کا مالک اسی کو سمجھو اور اپنی پسند و ناپسند' اپنی چاہت'

اپنی مرضی' ان سب سے اس کی اطاعت کے حق میں دستبردار ہو جاؤ! یہ اطاعت تمہاری پوری زندگی پر حاوی ہونی چاہئے' بغیر اس سے کہ اُس کے کسی جزو کو اُس سے مستثنیٰ کیا گیا ہو! اسی کی مرضی کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالو! اور یہ پورا طرزِ عمل اختیار کرو اللہ کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر! اس منتخب نصاب میں اس سے پہلے ایک سے زائد مقامات پر عبادت کی حقیقت کی طرف توجہ دلائی جا چکی ہے۔ نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج جنہیں ہم عبادات کہتے ہیں' سب اصلاً اسی ہمہ گیر عبادت کے لئے مطلوب ہیں۔ یہ اس عبادتِ عظیم کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے فرض کئے گئے ہیں۔ نسیان اور غفلت کا علاج نماز سے کیا گیا۔ اپنے نفس کے تقاضوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے روزہ عطا کیا گیا۔ مال کی محبت کی گرفت دل سے کم کرنے کے لئے زکوٰۃ فرض کی گئی۔ اور ان تمام مقاصد کو پورا کرنے والی ایک جامع اور عظیم عبادت حج کی شکل میں تجویز کی گئی۔ لیکن غور کیجئے کہ ان سب کا مقصد یہی تو ہے کہ بندگیٔ رب کا تقاضا پورا کرنے میں جو رکاوٹیں اور موانع ہیں انسان کے اندر ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ارکانِ اسلام کی پہلی سیڑھی کے بعد "عبادت رب" کی یہ دوسری سیڑھی منطقی طور پر بہت مربوط ہے : ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ﴾

تیسری سیڑھی : افعالِ خیر' خدمت خلق

لیکن اسی پر بس نہیں' ابھی اس سے آگے ایک تقاضا اور بھی ہے : ﴿ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ ﴾ نیک کام کرو' بھلے کام کرو' خلق خدا کی خدمت پر کمربستہ ہو جاؤ۔ ((خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ)) ـــــ اسے یوں سمجھئے کہ اللہ کی عبادت کا تقاضا تو اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے سے پورا ہو جائے گا' لیکن اس سے آگے بھی انسان کے لئے نیکی کا' خیر کا' بھلائی کا ایک وسیع و عریض میدان ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا سورۃ البقرہ میں : ﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ﴾ کہ ہر کسی نے اپنا کوئی نہ کوئی ہدف بنایا ہوا ہے جس کی طرف اس کا رُخ ہے' پس اے اہل ایمان! تم نیکیوں میں' بھلائیوں میں' حسنات میں' خیرات میں' صدقات میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ تو جہاں تک

عبادت کا تقاضا ہے وہ تو احکامِ خداوندی پر عمل کرنے سے پورا ہو گیا' لیکن اب آگے بڑھو' یہ خدمت خلق کا میدان کھلا ہوا ہے۔ یہ ہے مفہوم "وَافْعَلُوا الْخَيْرَ" کا۔

البتہ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ خدمت خلق کا ابتدائی درجہ یقیناً وہی ہے جس سے سب واقف ہیں' یعنی بھوکے کو کھانا کھلانا' کسی کے پاس تن ڈھانپنے کو اگر کچھ نہیں ہے تو اس کا تن ڈھانپ دینا' کسی بیمار کے علاج معالجے اور دوا دارو کا اہتمام کر دینا' کسی کی عیادت یا مزاج پرُسی کر دینا وغیرہ۔ حضور اکرم ﷺ نے تو اس کو یہاں تک وسعت دی ہے کہ فرمایا : ((تبسُّمُكَ فِي وَجْهِ اَخِيْكَ صَدَقَةٌ)) "اپنے کسی ملاقاتی سے کشادہ روئی اور متبسم چہرے کے ساتھ ملاقات کر لینا بھی صدقہ ہے"۔ یہ بھی خیر اور نیکی کا کام ہے کہ وہ آئے تو آ کر پشیمان نہ ہو کہ میں خواہ مخواہ کیوں آیا' بلکہ وہ محسوس کرے کہ تمہیں اس سے مل کر ایک فرحت ہوئی ہے' تاکہ اس کی طبیعت میں بھی ایک انبساط پیدا ہو۔ تو یقیناً خیر' بھلائی' نیکی اور خدمت خلق کا بنیادی تصور یہی ہے' لیکن اس سے ایک بلند تر سطح بھی ہے۔

خدمت خلق کی بلند ترین سطح

وہ بلند تر سطح یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی زندگی غلط رخ پر پڑ گئی ہے اور وہ لوگ کہ جو اپنی غفلت اور نادانی کے باعث ہلاکت اور بربادی کی طرف بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں' ان کی عاقبت سنوارنے کی فکر کرنا۔ جیسے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسے ہے جیسے کہ آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ ہے' تم اس میں گر پڑنا چاہتے ہو اور مَیں تمہارے کپڑے پکڑ پکڑ کر تمہیں گھسیٹ کر اس ہلاکت خیز انجام سے بچانا چاہ رہا ہوں۔ چنانچہ خلق خدا کو خدا کی بندگی کی دعوت دینا اور بھولے اور بھٹکے ہوؤں کو صراطِ مستقیم اور سواء السبیل پر لے آنے کی کوشش کرنا درحقیقت خدمت خلق کی بلند ترین سطح ہے۔ موٹی سی بات ہے' ہم خود سوچ سکتے ہیں' ایک انسان کے پیٹ میں لگی ہوئی بھوک کی آگ کو اگر آپ نے بجھا بھی دیا تو کیا حاصل اگر وہ سموچا آگ کا نوالہ بننے والا ہے! آپ کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس کا دارومدار دراصل اس بات پر ہے کہ آیا آخرت پر یقین

ہے یا نہیں ؟ اگر یقین ہے تو جیسا کہ ہم سورۃ التحریم میں پڑھ آئے ہیں کہ کسی شخص کو اگر آخرت کا یقین ہے تو وہ اپنی اولاد اور اپنے اہل و عیال کے بارے میں سب سے بڑھ کر جس چیز کے لئے کرشاں ہو گا وہ ان کی آخرت کی بھلائی ہو گی۔ اگر آخرت نگاہوں کے سامنے ہے ہی نہیں تو ظاہر بات ہے کہ اپنے اہل و عیال کی صرف دنیوی منفعت ہی پیش نظر رہے گی۔ یہی معاملہ یہاں بھی ہے۔ ایک ایسے شخص کے نزدیک جس کی باطنی آنکھ کھل چکی ہے اور جسے آخرت کی حقیقت نظر آ گئی ہے اصل خدمت خلق کا کام خلق خدا کو راہِ ہدایت پر لانا ہو گا کہ جس سے ان کی ابدی زندگی ہمیشہ کی زندگی سنور جائے۔ اگرچہ ظاہر بات ہے کہ ایسا شخص اس دنیا میں بھی کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھے گا۔ آیہ بر میں ہم تفصیل کے ساتھ یہ پڑھ چکے ہیں : ﴿ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ﴾ اسی حقیقت کو حضور ﷺ نے یوں تعبیر فرمایا تھا : ((مَنْ یُحْرَمِ الرِّفْقَ فَقَدْ حُرِمَ الْخَیْرَ كُلَّهٗ)) کہ جو شخص دل کی نرمی سے، دردمندی سے محروم ہے وہ گویا کل کے کل خیر سے محروم ہو گیا۔ تو خدمت خلق کے اس درجے کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔

ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں خدمت خلق کے یہ دونوں پہلو بتمام و کمال نظر آتے ہیں۔ وحی کے آغاز سے قبل بھی آپ ﷺ انسانیت کاملہ کی معراج پر فائز تھے۔ انسانی ہمدردی کا مادہ آپؐ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آپ ﷺ یتیموں کی خبر گیری کرنے، بیواؤں کی سرپرستی فرمانے، مساکین اور محتاجوں کی امداد کرنے اور مسافروں کی مہمان نوازی فرمانے میں پیش پیش تھے، جس کی سب سے بڑی شہادت آپؐ کی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے اس موقع پر دی تھی جب پہلی وحی کے بعد آپؐ پر بربنائے طبع بشری کچھ گھبراہٹ کی کیفیت طاری تھی۔ لیکن خلعت نبوت سے سرفراز کئے جانے کے بعد جب حقائق منکشف ہوئے، جب آپ ﷺ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے ﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ تو اب آپؐ کی پوری زندگی، آپؐ کی تمام توانائیاں، آپؐ کا ایک ایک لمحہ بسر ہو رہا ہے خلق خدا کو آخرت کے برے انجام سے بچانے کی کوشش میں۔ یہی خدمت خلق کی معراج ہے۔

یہ اس کی بلند ترین منزل ہے۔

چڑھائی تو بہرطور چڑھنی ہے!

بہرحال پہلی آیت میں یہ تین سیڑھیاں سامنے رکھ دی گئیں کہ اب تمہیں چڑھنا ہوگا۔ ایک عجیب آیت قرآن مجید میں سورۃ المدثر میں وارد ہوئی ہے : ﴿ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴾ "ہم چڑھوائیں گے اُسے بلندی"۔ ولید بن مغیرہ کے ذکر میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ آخرت کے عذاب کا نقشہ کھینچا گیا کہ وہاں چڑھایا جائے گا اسے بلندی پر' اسے بلندی چڑھوائی جائے گی۔ یہ بلندی انسان کو بہرحال چڑھنی پڑے گی' اس دنیا میں چڑھ لے یا پھر آخرت میں وہ یہ چڑھائی چڑھنے پر مجبور ہوگا۔ اس دنیا میں اہل ایمان کو عمل صالح کی چڑھائی چڑھنی ہوگی۔ اسی طرح دین کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے محنت اور جدوجہد درکار ہوگی' سیڑھی بہ سیڑھی چڑھنا ہوگا۔ ہم پر تو ارکانِ اسلام کی پابندی ہی بہت شاق ہے۔ اس سے اوپر پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت کاملہ ہمارے اعتبار سے بہت بھاری' بہت ثقیل' بہت مشکل معلوم ہوتی ہے ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا اِلٰہ را!

پھر اس سے اوپر بھی ایک تقاضا ہے دین کا۔ اپنے آپ کو ہمہ تن خلق خدا کی خدمت میں صرف کر دینا' اس کے لئے وقف کر دینا' اور لگا دینا۔ یہ ہے مطالباتِ دینی کی تیسری منزل۔

فلاح کی اُمید!

ان تین تقاضوں کے بیان کے بعد فرمایا : ﴿ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ "تاکہ تم فلاح پاؤ"! لَعَلَّ کا اس انداز میں ترجمہ ہم اس لئے کرتے ہیں کہ یہ کلامِ الٰہی ہے' ورنہ "لَعَلَّ" کا اصل لفظی مفہوم عربی زبان میں "شاید" کا ہے۔ گویا لغوی ترجمہ یوں ہوگا "شاید کہ تم فلاح پاؤ" لیکن چونکہ شاہانہ کلام میں لفظ "شاید" اگر آئے تو وہ ایک حتمی وعدے کی صورت ہوتا ہے' جیسے کوئی بادشاہِ وقت اگر اپنے کسی درباری سے یہ کہے کہ تم یہ کام کرو شاید کہ ہم تمہیں فلاں چیز دیں تو دراصل یہ ایک پختہ وعدہ ہے۔ اسلئے سورۃ الحج کی اس

آیت میں ہم ترجمہ یوں کرتے ہیں : "تاکہ تم فلاح پاؤ"۔ لیکن اس آیت کے حوالے سے بھی کم سے کم اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہو جاتی ہے کہ یہ فلاح ایسے ہی حاصل ہو جانے والی چیز نہیں ہے' یہ اتنی بے وقعت شے نہیں ہے کہ بس زبان سے چند کلمات ادا کرنے سے حاصل ہو جائے۔ اگر اسلام اور ایمان کا صرف زبانی اقرار کافی ہوتا تو ان الفاظ مبارکہ کا یہاں لانا کہ ﴿ اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ ﴾ یہ سب تحصیل حاصل قرار پائے گا۔ پھر یہ سارا کلام' نعوذ باللّٰہ مِنْ ذٰلِک ایک مہمل اور عبث کلام قرار پائے گا' اگر کوئی یہ سمجھے کہ فلاح اس کے بغیر بھی حاصل ہوتی ہے۔

یہاں گویا کہ اس آیۂ مبارکہ کی شکل میں وہ پورا سبق ایک مرتبہ پھر ہمارے سامنے آ گیا جو سورۃ العصر کا حاصل اور ہمارے اس پورے علمی و ذہنی سفر کا نقطۂ آغاز ہے : ﴿ وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ○ ﴾ وہاں وہ بات منفی اسلوب میں تھی۔ "زمانہ گواہ ہے کہ یقیناً تمام انسان خسارے اور گھاٹے میں رہیں گے" ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ ﴾ "سوائے ان کے جو ایمان لائیں' نیک عمل کریں' ایک دوسرے کو حق کی تلقین اور وصیت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں"۔ یہاں دیکھئے وہی بات ایک مثبت اسلوب میں آئی ہے کہ اگر فلاح کے طالب ہو' کامیابی چاہتے ہو' رشد سے ہم کنار ہونا چاہتے ہو' تو تمہیں محنت و مشقت لازماً کرنی ہوگی ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ!

وہ محنت کیا ہے؟ اس کی وضاحت ہے سورۃ الحج کی اس آیت میں کہ : ﴿ اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا ﴾ پہلی چیز ہے نماز' اور اس کے ساتھ ہی گویا بقیہ ارکانِ اسلام زکوٰۃ' روزہ اور حج بھی اس کے تابع ہیں اور ان کا التزام بھی ضروری ہے۔ پھر دوسرا تقاضا بندگیٔ رب کا ہے ﴿ وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ﴾ کہ ہر معاملے میں اپنے رب کی اطاعت پر کمربستہ ہو جاؤ' پوری زندگی کو اس کے حوالے کر دو اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ﴿ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ ﴾ بھلائی پر' خدمت خلق پر کمربستہ ہو جاؤ۔ لوگوں کی خیر خواہی' لوگوں کی فلاح' خلق خدا کی

ابدی بہبود کے لئے اپنی قوتیں' اپنی توانائیاں اور اپنی صلاحیتیں صرف کردو' اپنے اوقات لگاؤ اور کھپاؤ! یہ ساری محنت کرو تو امید کی جاسکتی ہے کہ ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ شاید کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اس کے بعد دوسری آیت میں جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے' سورۃ العصر میں بیان کردہ نجات کی چار شرائط میں سے آخری دو یعنی ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ کے لئے ایک جامع اصطلاح آگئی "جہاد"۔

جہاد کی اہمیت

اب ذرا جہاد کی اہمیت کے حوالے سے دونوں آیات کا موازنہ کیجئے! پہلی آیت میں چار فعل امر آئے تھے: اِرْكَعُوْا' وَاسْجُدُوْا' وَاعْبُدُوْا' اور وَافْعَلُوا' اور اس دوسری آیت میں جو حجم کے اعتبار سے بہت طویل ہے صرف ایک فعل امر آرہا ہے ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ معلوم ہوا کہ جہاد کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ پوری آیت جہاد اور اس کی غرض وغایت ہی کے بیان پر مشتمل ہے۔

فرمایا "جہاد کرو اللہ کے لئے" "فِي اللّٰهِ" دراصل فی سبیل اللہ کا مخفف ہے۔ مراد ہے اللہ کی راہ میں "in the cause of Allah" یا یوں کہئے: "for the cause of Allah" اس کے لئے محنتیں کرو' جدوجہد کرو' کوششیں کرو۔ کشمکش' تصادم اور مجاہدہ اس میدان میں ہونا چاہئے۔ یہ تمہارے ایمان کا چوتھا بنیادی تقاضا ہے۔

"حَقَّ جِهَادِهٖ" کا حقیقی مفہوم

یہاں نوٹ کیجئے کہ اس رکوع کے پہلے جزو میں شرک کی مذمت اور اس کے سبب کے بیان کے ضمن میں الفاظ وارد ہوئے تھے: ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ وہی اسلوب یہاں ہے: ﴿جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ یہ محنت' کوشش' جدوجہد اور تصادم ہوگا اللہ کے لئے' جس پر تم ایمان لائے ہو' جسے تم نے اپنا مطلوب و مقصود اور محبوبِ حقیقی قرار دیا ہے' اور یہ جہاد اور مجاہدہ' کوشش اور یہ سعی اتنی ہونی چاہئے جتنا اور جیسا کہ اس کا حق ہے۔ غور کرو کہ تم پر کس کا کتنا حق ہے! کیا تم خود اپنے خالق ہو کہ

اپنے نفس کے تقاضوں اور اس کے حقوق ہی کے پورا کرنے میں اپنی تمام توانائیاں' اپنی قوتیں اور اپنی صلاحیتیں صرف کر رہے ہو؟ سوچو' کس کے تم پر کتنے حقوق ہیں! والدین کے حقوق ہیں' ادا کرو! لیکن غور کرو کہ والدین کے دل میں محبت و شفقت کے جذبات پیدا کرنے والا کون ہے؟ تم پر کس کا حق کتنا ہے' معین تو کرو۔ اگر کوئی اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اپنے وطن کے لئے وقف کر چکا ہے تو کیا صرف وطن کے حقوق کی ادائیگی ہی اس کے ذمے تھی؟ یہ درست ہے کہ وطن کا زیر بار احسان ہر شخص ہوتا ہے۔ وہ زمین کہ جس سے اس کے لئے غذا کے خزانے ابلتے رہے ہیں یقیناً اس کا ایک احسان اس کی گردن پر ہے۔ لیکن احسانات کو ناپو تو سہی' کس کا کتنا حق ہے! معلوم ہو گا کہ تمام حقوق پر فائق حق اللہ کا ہے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمام حقوق اللہ کے حقوق کے تابع ہو جائیں۔ وہ بات جو شرک کی حقیقت کے ضمن میں "شرک فی الحقوق" کی بحث میں کافی تفصیل سے بیان ہو چکی ہے اسے یہاں اپنے ذہن میں تازہ کیجئے کہ انسان پر اوّلین حق اللہ کا ہے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں یہ مضمون آیا تھا: ﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ﴾ "کہ شکر کر میرا اور اپنے والدین کا"۔ اگر یہ فہرست مرتب کی جائے کہ انسان پر کس کس کے حقوق ہیں تو سرفہرست آئے گا اس کا خالق و مالک' اس کا پروردگار' اس کا پالن ہار۔ جس نے اسے عدم سے وجود بخشا' جو اس کی کل ضروریات فراہم کر رہا ہے' جو اسے درجہ بدرجہ تدریجی مراحل سے گزارتا ہوا ترقی کے مراحل طے کرا رہا ہے' وہ ہے کہ جس کے حقوق سب سے فائق ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان یقیناً صد فی صد درست ہے کہ ((وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) "تمہارے نفس کا تم پر حق ہے' تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے اور تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے"۔ یہ سب حقوق تسلیم' لیکن یہ طے ہے کہ اللہ کا حق سب سے فائق ہے۔ تو اب ذرا سوچو کہ تمہاری توانائیوں کا کتنے فیصد اپنے نفس کیلئے صرف ہو رہا ہے! کتنے فیصد تم اپنی اولاد کیلئے صرف کر رہے ہو' کتنا جزو اپنی توانائیوں کا تم نے اپنی قوم یا وطن کے لئے وقف کیا ہے اور اس کا کتنا حصہ ہے جو تم نے خدا کے لئے وقف کیا ہے؟ ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ کہیں کسی

محفل میں ذرا سا کلمۂ خیر کہہ دینے یا دین کے کسی کام میں کوئی چندہ دے دینے سے یہ سمجھ لینا کہ اللہ کا حق ادا ہو گیا' انگلی کٹوا کر شہیدوں میں شریک ہونے کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے! یہاں اس کا سدباب کیا جا رہا ہے : ﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾

ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے کہ واقعتاً انسان کی شخصیت کے دو ہی پہلو ہیں' ایک اس کا علم اور فکر ہے' اس کی نظری اور فکری قوتیں ہیں' اور دوسرا اس کا عمل ہے' بھاگ دوڑ ہے' سعی و جہد ہے' اس کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو بروئے کار آنا ہے۔ ان دونوں کا جو نقطۂ عروج ہے اس کو اس رکوع کے دو حصوں میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک ہے اللہ کی معرفت' اللہ کا اندازہ جیسا کہ اس کا حق ہے : ﴿ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ اور دوسرا ہے اللہ کے لئے محنت' بھاگ دوڑ اور سعی و جہد۔ ﴿ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کہ انسان کا جینا اور مرنا' جاگنا اور سونا' بیٹھنا اور اٹھنا' یہ سب درحقیقت اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔ اسی کے لئے جدوجہد' اسی کے لئے کوشش' اسی کے لئے بھاگ دوڑ' گویا اسی میں انسان ہمہ تن اپنے آپ کو جھونک دے' یہ ہے جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ

فریضۂ رسالت کی ادائیگی اب اُمت کے ذمے ہے!

اگلا لفظ بہت ہی معنی خیز اور قابل توجہ ہے : ﴿ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ ﴾ کہ اے مسلمانو' اے ایمان کے دعوے دارو اور اے ہمارے رسول محمد ﷺ کے امتی ہونے کے دعوے دارو! تم اپنا مقام اور مرتبہ پہچانو' تم اُسی طرح چن لئے گئے ہو جس طرح رسولؐ چنے ہوئے ہیں۔ لفظ "اصطفٰی" اور "اجتبٰی" عربی زبان کے دو بڑے قریب المفہوم الفاظ ہیں۔ اگرچہ ان میں وہ ایک باریک سا فرق بھی ہے جو انگریزی کے دو الفاظ "choice" اور "selection" میں ہے۔ "choice" میں پسند کرنے والے کی پسند کو زیادہ دخل ہوتا ہے' جبکہ "selection" فی الاصل کسی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ کسی معینہ ہدف کے لئے کسی موزوں ترین شخصیت یا جماعت کا انتخاب "selection" کہلائے گا۔ "اصطفاء" میں choice کا معاملہ ہوتا ہے اور اجتباء میں selection کا۔ لیکن اپنے

مفہوم کے اعتبار سے یہ دونوں الفاظ بہرحال بہت قریب المعنی ہیں۔ چنانچہ محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے یہ دونوں ہی الفاظ مستعمل ہیں۔ محمد مصطفیٰ اور احمد مجتبیٰ ﷺ۔ چنانچہ وہی لفظ جو رسولوں کے لئے مستعمل ہے یہاں اُمت کے لئے آیا ہے "هُوَ اجْتَبٰكُمْ" تمہیں چن لیا گیا ہے، تمہیں پسند کر لیا گیا ہے، ایک مقصد عظیم کے لئے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے۔ یہ مقصد عظیم کیا ہے؟ ذہن میں رکھئے کہ اس رکوع کے نصف اوّل میں نبوت و رسالت کے جس سلسلۃ الذھب کا بیان آیا تھا، اس سنہری زنجیر میں گویا ایک کڑی کا اضافہ ہوا ہے ختم نبوت کے باعث۔ اب نہ کوئی نبی آنے والا ہے اور نہ ہی کوئی اور رسول مبعوث ہو گا۔ چنانچہ خلق خدا پر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت کا فریضہ اب اس اُمت کے سپرد کیا گیا ہے جو اپنے آپ کو منسوب کرتی ہے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف۔ گویا کہ وہ ہدایت جس کی تلقی اولاً جبرئیل نے کی تھی اللہ سے، اور پہنچا دیا تھا جسے محمد رسول اللہ ﷺ تک، اور پھر جسے پہنچایا محمد رسول اللہ ﷺ نے اُمت تک، اب اس اُمت محمدؐ کا فریضۂ منصبی ہے کہ وہ اُسے پہنچائے پوری نوعِ انسانی تک۔ گویا یہ اُمت اس سلسلۃ الذھب کی ایک کڑی (Link) کی حیثیت سے مستقلاً اس کے ساتھ جوڑ دی گئی، ٹانک دی گئی۔ اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہاں الفاظ بالکل ہم وزن لائے گئے ہیں۔ وہاں فرمایا تھا ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ اللہ چن لیتا ہے، پسند کر لیتا ہے فرشتوں میں سے بھی اپنے ایلچی اور پیغامبر اور انسانوں میں سے بھی۔ اور یہاں فرمایا: "هُوَ اجْتَبٰكُمْ" اے مسلمانو، اے ایمان کے دعوے دارو! اب تم چن لئے گئے ہو، تمہارا انتخاب ہو گیا ہے ایک عظیم مقصد کے لئے۔

اُمت مسلمہ کا یہ "اجتباء" یا چناؤ کس مقصد کے لئے ہوا، اس کا جواب آگے آ رہا ہے: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ کہ تمہارے اس "انتخاب" (selection) کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ رسولؐ گواہ ہو جائیں تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ پوری نوعِ انسانی پر ـــــ یہ مقصد عظیم ہے جس کے لئے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے

لیکن آیت کے اس ٹکڑے سے پہلے ایک ضمنی بات درمیان میں آئی ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایک "subordinate clause" جملے کے بیچ میں شامل کر دی گئی ہے۔ چنانچہ جس اُمت پر یہ بھاری ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے اس کی ہمت بندھانے کے لئے کچھ ترغیب و تشویق کے انداز میں فرمایا گیا : ﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ کہ اس دین کے معاملے میں اللہ نے تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ ان الفاظ مبارکہ کا ایک عمومی مفہوم تو یہ ہے کہ یہ دین' دین فطرت ہے۔ خلاف فطرت کوئی حدود اور قیود یہاں عائد نہیں کی گئیں۔ فطری تقاضوں کے اوپر کوئی غیر فطری بندش اور پابندی یہاں نہیں لگائی گئی۔ اس کی تعلیمات فطرتِ انسانی کے لئے معروف اور جانی پہچانی ہیں۔ ان سے انسان طبعاً مانوس ہے۔ اس پہلو سے یہ دین آسان دین ہے۔ اس میں کوئی تنگی نہیں' کوئی سختی نہیں' اس میں رہبانیت کی پابندیاں نہیں' اس میں نفس کو کچل دینے والی ریاضتیں نہیں' اس میں رسومات کا کوئی لمبا چوڑا طومار نہیں۔ بہت سادہ دین فطرت ہے۔

بنو اسماعیل کے لئے اضافی سہولت

آیت کا یہ مفہوم اُمت مسلمہ کے تمام افراد سے متعلق ہے' خواہ دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتے ہوں' لیکن بالخصوص وہ لوگ جو قرآن کے اوّلین مخاطب تھے' جن سے اس اُمت محمدؐ کا نیو کلیس تیار ہوا' جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور اس ناطے ان کا رشتہ جڑتا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ' ان کیلئے اس پہلو سے بھی اس دین میں کوئی تنگی نہیں ہے کہ یہ تو ان کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ یہ بیت اللہ جس سے محبت و عقیدت انہیں وراثتاً بھی ملی تھی انہی کا بنایا ہوا گھر ہے جس کے گرد طواف کا سلسلہ ان کے ہاں دورِ جاہلیت میں بھی جاری رہا' قربانی کا سلسلہ جاری رہا' منیٰ اور عرفات کا قیام جاری رہا' یہ سب چیزیں تو تمہاری نسلی اور قومی روایات کا جزو بن چکی ہیں۔ اس پہلو سے تمہارے لئے تو کوئی تنگی نہیں' اس دین کے اور تمہارے درمیان اجنبیت کا کوئی پردہ حائل نہیں۔ ہاں' جو غلط باتیں تم نے اس میں شامل کر دی تھیں ان کو

ہٹادیا گیا ہے۔ اسی طرح تمہارے جو اپنے رواج اور معاشرتی طور طریقے تھے بنیادی طور پر انہی کی اساس پر شریعت محمدیؐ کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔ ان میں جو چیزیں غلط تھیں انہیں کاٹ پھینکا گیا اور جو صحیح تھیں انہیں برقرار رکھا گیا۔ لہٰذا یہاں خطاب کے اعتبار سے جو لوگ نبی اکرمؐ اور قرآن حکیم کے اولین مخاطب تھے ان کے حوالے سے کہا گیا : ﴿ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ﴾ "یہ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے"۔ تمہارے لئے اس کے قبول کرنے میں یا اس کے علمبردار اور پرچارک بننے میں کہیں کوئی رکاوٹ نہیں ہے' کوئی اجنبیت کا پردہ حائل نہیں۔

آگے ارشاد ہوتا ہے : ﴿ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا ﴾ "اس نے تمہارا نام رکھا مسلمان' پہلے بھی اور اس میں بھی"۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اس اُمت کے لئے لفظ مسلمان تجویز کیا تھا۔ خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھاتے ہوئے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی زبان پر یہ دعا جاری رہی : ﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ﴾ "اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار (مسلمان) بنائے رکھ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک اُمت مسلمہ برپا کیجیو!" تو تمہارا یہ نام تمہارے جد امجد نے رکھا ہے۔ اللہ نے بھی اس کتاب میں' اس کلام پاک میں تمہیں اسی نام سے موسوم کیا ہے : ﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾ اس پہلو سے گویا ایک مرتبہ پھر اعادہ ہو گیا اسی حقیقت کا جو اس سے پہلے سورۃ حٰمٓ السجدۃ کے درس میں آ چکی ہے کہ ایک داعی حق اور ایک داعی الی اللہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا تعارف صرف بطور مسلمان کرائے : ﴿ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ کسی اور گروہی نسبت یا کسی تعلق کو نمایاں کرنا درحقیقت دعوتِ اسلامی یا دعوت الی اللہ کے مزاج کے منافی ہو جائے گا۔

شہادت علی الناس : امت کا فرضِ منصبی

یہ ضمنی مضمون تھا۔ اس کے بعد اگلے الفاظ مبارکہ کو جوڑ لیجئے ﴿ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ ﴾ سے۔ کہ اے مسلمانو! تمہارا انتخاب ہو گیا ہے' تم چن لئے گئے ہو ایک مقصد عظیم کے

لئے۔ اور وہ مقصد عظیم یہ ہے کہ سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد اب کارِ نبوت کی ذمہ داری مجموعی طور پر تمہارے کاندھوں پر ہے۔ شہادت علی الناس کا فریضہ جو انبیاء ادا کرتے رہے وہ اب تمہارے ذمے ہو گا۔ اللہ کی طرف سے خلق خدا پر اتمامِ حجت' اللہ کا پیغام خلق خدا تک پہنچا دینا' جیسے کہ پہنچا دینے کا حق ہے' اور اپنے قول و عمل سے اس دین اور اس توحید کی شہادت دینا' جیسے کہ علامہ اقبال نے کہا ع "دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی!" ـــــ یہ سب کام اب تمہیں بحیثیت اُمت کرنے ہوں گے۔ ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ﴾ "تاکہ ہو جائیں رسول گواہ تم پر" ـــــ انہوں نے تو اِبلاغ و تبلیغ کا حق ادا کر دیا' انہوں نے اللہ کا کلام تمہیں پہنچا دیا خواہ اس راہ میں انہیں ماریں کھانی پڑیں' گالیاں سننی پڑیں' استہزاء اور تمسخر کا ہدف بننا پڑا' ان پر پتھروں کی بارش ہوئی' ان کے دندانِ مبارک شہید ہوئے اور خواہ انہیں اپنے قریب ترین اعزہ کی جانوں کا نذرانہ اللہ کے حضور میں پیش کرنا پڑا۔ ذرا تصور میں لائیے حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب کے اعضاء بریدہ لاشے کو۔ ناک کٹی ہوئی' کان کٹا ہوا' اسی پر بس نہیں' سینہ چاک کر کے کلیجہ تک چبا ڈالا گیا تھا ـــــ محمد ﷺ نے یہ سارے شدائد جھیلے' تمام مصیبتیں برداشت کیں' مسلسل تیئیس برس تک سخت ترین مشقت سے آپ کو سابقہ رہا۔ اس میں تین برس کی وہ قید بھی ہے' شعب بنی ہاشم کی قید' جس میں سخت ترین فاقہ اور شدید ترین بھوک کی آزمائش بھی آئی۔ اسی میں وہ یوم طائف بھی ہے جس کا نقشہ یہ ہے کہ ہر طرف سے پتھراؤ ہو رہا ہے' اور محمد رسول اللہ ﷺ کا جسم مبارک لہولہان ہو گیا ہے! پھر اس میں غارِ ثور کا وہ صبر آزما مرحلہ بھی ہے' اس میں وہ دامن اُحد کا جاں گسل معرکہ بھی ہے' اس میں بدر و حنین کے تمام مراحل آئے' لیکن ان تمام مراحل کا نتیجہ کیا ہے؟ محمد ﷺ نے اللہ کی توحید کی گواہی اس شان سے دی کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اللہ کے کلام کا ابلاغ اس طور سے فرمایا کہ اس کا حق ادا کر دیا۔ اللہ کے دین کی گواہی اپنے قول سے بھی دی اور عمل سے بھی۔ اور اس دین کے نظام کو عملاً برپا کر کے دکھا دیا' تاکہ کسی کے پاس کوئی عذر نہ رہے' کوئی یہ بہانہ پیش نہ کر سکے کہ اے اللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ تو کیا چاہتا ہے!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گواہی

چنانچہ ذرا چشم تصور سے دیکھئے! حجتہ الوداع کا موقع ہے' عرفات کا میدان ہے' حضور ﷺ نے اپنے اس آخری حج میں متعدد خطبے ارشاد فرمائے' عرفات کے میدان میں بھی اور منیٰ کی وادی میں بھی۔ تیئس برس کی محنت شاقہ کا حاصل' ایک لاکھ سے زائد افراد کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر ہے۔ عرب کے کونے کونے سے کھنچ کر آئے ہوئے لوگ جمع ہیں۔ حضور ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں جس کے آغاز ہی میں آپؐ یہ فرما کر لوگوں کو چونکا دیتے ہیں کہ لوگو شاید دوبارہ اس مقام پر ملاقات نہ ہو! گویا اشارہ دے دیا گیا کہ یہ الوداعی خطبہ ہے' آخری باتیں ہیں جو حضور ﷺ ارشاد فرما رہے ہیں۔

اسی خطبے میں وہ الفاظ بھی آئے جن کا حوالہ سورۃ الحجرات کے درس کے ضمن میں دیا جا چکا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات کا ملخص' لب لباب اور اہم نکات کو بتکرار و اعادہ بیان فرمایا کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں۔ عورتوں اور غلاموں کے حقوق کی طرف آپؐ نے انتہائی تاکیدی انداز میں توجہ دلائی۔ بڑا مفصل خطبہ ہے جسے پورا نقل کرنا یہاں پیش نظر نہیں ہے۔ خطبے کے اخیر میں آپؐ پورے مجمع سے ایک سوال کرتے ہیں : اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟ لوگو' کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟ صحابہ کرامؓ کا عام معمول یہ تھا کہ حضورؐ جب بھی بغرض تعلیم ان سے کوئی سوال کرتے تھے تو صحابہؓ بالعموم اولاً اس کے جواب میں کہتے تھے اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ (یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں) پھر جب آپؐ دوبارہ یا سہ بارہ سوال کرتے تب وہ اپنی سمجھ کے مطابق مختصر سا جواب دیتے تھے۔ لیکن اس موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ خلافِ معمول اس ایک سوال کا مفصل جواب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیک زبان دیا کہ "اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ اَدَّیْتَ وَ نَصَحْتَ" بلکہ ایک روایت میں مزید تفصیل وارد ہوئی : "اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَۃَ وَ اَدَّیْتَ الْاَمَانَۃَ وَ نَصَحْتَ الْاُمَّۃَ وَ کَشَفْتَ الْغُمَّۃَ" کہ اے نبیؐ ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حق امانت ادا کر دیا' آپ نے حق تبلیغ ادا کر دیا' آپ نے حق نصح و خیر خواہی ادا کر دیا' آپ نے گمراہی کے پردوں کو چاک کر دیا اور ہدایت کا سراج منیر اور خورشید تاباں آپ کی

کوششوں کے نتیجے میں اس وقت نصف النہار پر چمک رہا ہے ـــــ حضورؐ نے صحابہ کرامؓ سے یہ گواہی تین مرتبہ لی۔ پھر آپؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور تین مرتبہ زبان سے یہ الفاظ ادا فرمائے : "اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ۔ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ۔ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ" تفصیل یہاں تک آتی ہے کہ آپؐ نے اپنی انگشت شہادت سے پہلے اشارہ فرمایا آسمان کی طرف، پھر لوگوں کی طرف، زبان پر یہ الفاظ جاری تھے : "اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ" کہ اے اللہ! تو بھی گواہ رہ۔ اے اللہ! تو بھی گواہ رہ۔ اے اللہ! تو بھی گواہ رہ کہ میں آج سبکدوش ہو گیا۔ میری ذمہ داری ختم ہو گئی۔ تیری ایک امانت مجھ تک پہنچی تھی بواسطہ جبرئیل۔ پیغام تھا نوع انسانی کے لئے۔ میری حیثیت امین کی تھی، میں نے وہ ذمہ داری ادا کر دی۔ میں نے وہ پیغام لوگوں تک پہنچا دیا اور ان سے گواہی لے لی ہے کہ میں نے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا حق ادا کر دیا ہے۔

حضورؐ نے صحابہؓ سے گواہی کیوں لی؟

غور کرنا چاہئے کہ حضور ﷺ نے اس اہتمام کے ساتھ یہ گواہی کیوں لی۔ درحقیقت منصب نبوت و رسالت سے سرفراز ہونا جہاں ایک طرف باعث عزو شرف ہے وہاں دوسری طرف یہ ایک انتہائی کٹھن اور نازک ذمہ داری بھی ہے۔ ایک سادہ سی مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اگر آپ اپنے کسی عزیز کو کوئی پیغام بھیجیں کہ فلاں کام فلاں وقت تک ضرور ہو جائے، ورنہ بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ آپ نے کسی کی معرفت وہ پیغام بھیجا۔ گویا درمیان میں ایک ایلچی ہے جو آپ کے پیغام کو آپ کے عزیز تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ فرض کیجئے وہ کام نہیں ہوا۔ اب آپ تحقیق و تفتیش کریں گے کہ اس کام کے نہ ہونے کی وجہ سے جو نقصان ہوا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے! اگر تو پیغام پہنچ گیا تھا اور پھر اس عزیز نے وہ کام نہیں کیا تو آپ کا سارا گلہ شکوہ اس سے ہو گا، وہ ایلچی بری قرار پائے گا، اور اگر کہیں اس ایلچی نے کوتاہی کی ہے، اس نے پیغام پہنچایا ہی نہیں، تو ظاہر بات ہے آپ اپنے اس عزیز سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتے، سارا بوجھ آئے گا اس ایلچی پر کہ جس نے وہ ذمہ داری ادا نہ کی۔ یہ ہے وہ نازک اور کٹھن ذمہ داری جو انبیاء و رسل کے

کندھوں پر آتی ہے۔ اُن کی جانب سے اگر ابلاغ میں اور پہنچانے میں بالفرض کوئی کمی رہ جائے تو بقیہ انسانوں سے بازپرس کی نوبت تو بعد میں آئے گی' پہلے ان کی جواب طلبی ہو جائے گی۔ یہ بات سورۃ الاعراف کے آغاز میں نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے : ﴿ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ "ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی۔" اور یہی ہے اس آیت کا حاصل کہ : ﴿ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ﴾ کہ اے نبی پہنچا دیجئے جو کچھ نازل ہوا ہے آپ پر آپ کے رب کی جانب سے۔ اگر اس میں کوئی کمی ہوئی تو یہ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی شمار ہو گی۔ اگرچہ بظاہر احوال اس کا ہرگز کوئی امکان نہیں کہ اس معاملے میں نبی اکرم ﷺ سے کسی کوتاہی کا صدور ہوتا' لیکن یہاں دراصل مقامِ نبوت و رسالت کی نزاکت کا اظہار مقصود ہے۔

یہ بات ایک اور انداز میں بالکل آغاز ہی میں ان الفاظ میں واضح کر دی گئی تھی کہ ﴿ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴾ "ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں"۔ ایک بہت بڑی ذمہ داری آپ کے کاندھے پر آنے والی ہے۔ یہ ہے وہ بارِ امانت جو نبی اور رسول کے کندھے پر ہوتا ہے۔ رسول اس کو پہنچا کر بری ہو جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس نے گواہی دے دی حق کی' صداقت کی' توحید کی اور جو بھی اللہ کا پیغام آیا تھا اس کی۔ یہ گواہی اس نے قولاً بھی دے دی اور عملاً بھی۔ اور پھر لوگوں سے بھی یہ گواہی لے لی کہ "میں نے پہنچانے کا حق ادا کر دیا!" اب وہ بری ہو گیا۔ یہ ہے شہادت علی الناس۔ اسی کا ظہور ہو گا روزِ قیامت میدانِ حشر میں جب انفرادی محاسبے سے پہلے امتوں کے محاسبے کا مرحلہ آئے گا اور اُمتوں کو اجتماعی جواب دہی کے لئے کٹہرے میں آنا پڑے گا۔

رسولوں کی گواہی اپنی امتوں کے خلاف!

قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر یہ نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اُس وقت ہر اُمت کی

طرف بھیجا جانے والا رسول پہلے سرکاری گواہ (Prosecution Witness) کی حیثیت سے کھڑا ہو گا اور یہ شہادت دے گا' testify کرے گا کہ اے رب! تیرا جو پیغام مجھ تک پہنچا تھا میں نے بلاکم و کاست پہنچا دیا تھا۔ اب یہ لوگ اپنے طرزِ عمل کے خود ذمہ دار ہیں' یہ خود مسئول ہیں' یہ خود جواب دہ ہیں۔ یہ وہ بات ہے جو سورۃ النساء میں بڑی صراحت سے آئی ہے۔ اور ایک عجیب واقعہ سیرۃ النبیؐ کا اس کے ساتھ متعلق ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمائش کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا حضورؐ! آپ کو قرآن سناؤں' آپ پر تو وہ نازل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں' لیکن مجھے دوسروں سے سن کر کچھ اور ہی کیف اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے امتثال امر میں سورۃ النساء کی آغاز سے تلاوت شروع کی اور جب آیت نمبر ۴۱ پر پہنچے جس کے الفاظ یہ ہیں : ﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ "کیا حال ہو گا اس دن جبکہ ہم ہر اُمت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے' اور اے نبی آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان لوگوں کے خلاف!" تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا حسبک! حسبک! بس کرو! بس کرو! اب جو میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو نبی اکرم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

یہ ہے وہ نازک ذمہ داری کہ نبی کو میدانِ حشر میں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے اُمت کے خلاف گواہی دینی ہو گی کہ اے رب! میں بری ہوں' میں نے پہنچا دیا تھا اور اب یہ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں۔ جیسے کہ سورۃ المائدۃ کے اختتام پر نقشہ کھینچا گیا ہے کہ روزِ محشر حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال ہو گا : ﴿ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ "اے مسیح! کیا تم نے کہا تھا لوگوں سے کہ مجھے اور میری ماں کو بھی معبود بنا لینا اللہ کے ساتھ؟" جواب میں وہ عرض کریں گے کہ پروردگار! اگر میں نے یہ کہا ہوتا تو تیرے علم میں ہوتا۔ میں نے تو وہی کچھ کہا تھا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا۔ میں نے تو انہیں تیری بندگی کی دعوت دی تھی۔ یہ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔ یہ ہے وہ شہادت اور گواہی جس کے لئے قرآنی اصطلاح ہے "شہادت علی الناس"۔ دنیا میں تبلیغ' تلقین اور ابلاغ کے ذریعے سے انسانوں پر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت قائم کرنا' قولاً بھی اور

عملاً بھی۔ اور اسی کی بنیاد پر میدانِ حشر میں وہ گواہی ہو گی جس کی تفصیل سورۃ النساء کی آیت نمبر ۴۱ کے حوالے سے ہمارے سامنے آچکی ہے۔

تبلیغ دین کا کام اب اُمت کے ذمے ہے!

ہمارے لئے اصل قابل توجہ بات یہ ہے کہ خطبۂ حجۃ الوداع میں حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے گواہی لینے کے بعد آخری بات جو ارشاد فرمائی وہ یہ تھی "فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ" کہ اب پہنچائیں وہ جو یہاں ہیں ان کو جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اللہ کے پیغام کو نوع انسانی تک پہنچانے کا جو فریضہ انبیاء سرانجام دیتے تھے وہ اب اس اُمت کے ذمے ہے۔ قرآن جو ابدی ہدایت نامہ ہے' اس کی حفاظت کا ذمہ تو اللہ نے لے لیا۔ اب کسی نئی وحی کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ پیغامِ ربانی اپنے اتمامی اور تکمیلی درجے کو پہنچ چکا :

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾

چنانچہ تکمیل دین اور اتمامِ نعمت کے ساتھ ہی بعثت انبیاء و رُسل کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ خاتم النبیین اور آخر المرسلین قرار پائے اور اب اللہ کے پیغام کو خلق خدا تک پہنچانے کی ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ڈال دی گئی۔ گویا اب کارِ نبوت' کارِ تبلیغ' کارِ دعوت' فرائض رسالت اور نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت یہ تمام کام اب تا قیامِ قیامت اُمت کے ذمے ہیں۔ یہ فرضِ منصبی' اے مسلمانو اب تمہارے کاندھوں پر اجتماعی حیثیت سے عائد کر دیا گیا۔ یہ ہے وہ عظیم فریضہ اور یہ ہے نبوت و رسالت کے اس "سلسلة الذهب" (سنہری زنجیر) میں ایک مستقل کڑی کی حیثیت سے شامل کئے جانے کا مقام اور مرتبہ جو اے اُمت محمد (ﷺ) اب تمہیں حاصل ہوا ہے :

﴿ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ ﴾

"امت وسط" کا مفہوم

قرآن حکیم کے اسلوب سے متعلق اس اہم حقیقت کا بیان اس سے پہلے بھی متعدد

بار ہوا ہے کہ اہم مضامین قرآن میں دو مرتبہ ضرور ملیں گے' تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے مقام پر وہی مضمون بالعموم عکسی ترتیب کے ساتھ آتا ہے۔ اس کی ایک بڑی نمایاں مثال ہمیں یہاں نظر آتی ہے —— چنانچہ یہی مضمون سورۃ البقرۃ میں بھی آیا ہے۔ نوٹ کیجئے کہ سورۃ الحج کی اِس آیت میں جو ہمارے زیر درس ہے' لفظ اُمت وارد نہیں ہوا ہے' گو اس کی تشریح میں مَیں نے بازبار لفظ اُمت استعمال کیا ہے' جبکہ سورۃ البقرۃ میں یہ مضمون لفظ امت کے حوالے سے وارد ہوا ہے : ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ اے مسلمانو' غور کرو' تمہیں اُمت کیوں بنایا گیا! لغت میں "اَمَّ یَوُمُّ" کے معنی قصد کرنے اور ارادہ کرنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے اُمت کے معنی ہوئے ہم مقصد لوگوں کا گروہ! ایک ایسی اجتماعیت اُمت کہلائے گی جو کسی ایک مقصد یا کسی ایک نصب العین کے گرد جمع ہو۔ اس اُمت مسلمہ کو' جسے سورۂ آل عمران میں "خیر امت" بھی کہا گیا ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾' یہاں سورۃ البقرۃ میں اُمت وسط قرار دیا گیا ہے۔

اُمت وسط کے دو معنی کئے گئے ہیں' ایک تو اس اعتبار سے کہ جو شے درمیانی ہوتی ہے' جو وسط کی ہوتی ہے' وہ بہترین ہوتی ہے۔ اس معنی میں اس کا ترجمہ ہو گا بہترین امت۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ اس مفہوم کی مزید تائید کر رہی ہے : ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ "وسط" درحقیقت دو چیزوں کے مابین کڑی (Link) کو کہتے ہیں۔ گویا اب تم ایک کڑی (Link) کی حیثیت رکھتے ہو محمد ﷺ کے اور پوری نوعِ انسانی کے مابین۔ جس طرح جبرئیل علیہ السلام کڑی تھے اللہ اور محمد ﷺ کے درمیان! محمد ﷺ نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا کر اتمامِ حجت کر دیا' اس پر تم سے شہادت اور گواہی بھی لے لی۔ اب تم واسطہ اور ذریعہ (Link) ہو اس پیغام کے آگے پہنچنے کا۔ اب تمہارے ذریعے اس پیغام کو آگے پہنچنا اور پھیلنا ہے۔ نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت تمہارے ذریعے ہونی ہے۔ تو یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے اے مسلمانو! تمہیں "امت وسط" بنایا گیا ہے۔

سورۃ الحج میں پہلے رسول کا ذکر تھا : ﴿ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ ﴾ اور اس

کے بعد اُمت کا ذکر آیا : ﴿ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ جبکہ سورۃ البقرۃ میں ترتیب الٹ گئی ہے۔ یہاں اُمت کے ذکر سے بات شروع کی گئی : ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾ تمہیں بھی قیامت کے روز بطور گواہ پیش ہونا ہو گا اور اللہ کے دربار میں یہ گواہی دینی ہو گی کہ اے اللہ نوعِ انسانی کے نام تیرا جو پیغام قرآن حکیم کی شکل میں محمد رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے ہم تک پہنچا تھا ہم نے خلق خدا تک پہنچا دیا تھا' ہم نے حق تبلیغ ادا کر دیا تھا۔ اگر ہم نے اپنے اس فرضِ منصبی میں کوتاہی کی اور روزِ محشر ہم یہ گواہی نہ دے پائے تو سوچئے کہ دوسروں کے جرم سے بڑھ کر جرم ہمارا ہو گا۔ ہماری پکڑ پہلے ہو گی اور سب سے پہلے ہم مسئول اور ذمہ دار قرار دیئے جائیں گے کہ تم اس ہدایت کے خزانے کے اوپر سانپ بن کر بیٹھے رہے' تم نے اس کو دوسروں تک پہنچانے کا حق ادا نہیں کیا۔

اُمت کی غفلت شعاری

خلق خدا ہم پر الزام دھرے گی کہ اے اللہ! یہ تھے تیرے دین کے علمبردار' یہ تھے تیرے کلام کے امین اور حامل' انہوں نے نہ صرف یہ کہ ہم تک اسے نہیں پہنچایا بلکہ خود بھی اس پر عمل نہیں کیا' یہ اپنے وجود سے خود دین کے لئے ایک حجاب اور رکاوٹ بن گئے۔ جارج برنارڈ شا کا مشہور قول ہے کہ میں جب قرآن پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کتاب اور کوئی ممکن نہیں' لیکن جب میں مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ ذلیل قوم کا تصور نہیں کیا جا سکتا ـــــ یہ ہے وہ عملی شہادت جو مسلمان اپنے وجود سے' اپنے حال سے دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

جہاد کا مقصد اوّلین : فریضۂ شہادت علی الناس

بہرحال یہ شہادت علی الناس' یہ ابلاغ و تبلیغ دین' یہ دعوت اِلی اللہ کا فریضہ ادا کرنا' یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی غایت اولیٰ اور مقصد اوّلین! یہ ہے وہ فرضِ منصبی جس کی ادائیگی کے لئے بڑی محنت اور کوشش کرنی ہو گی' اس کے لئے جان و مال اور اوقات کا ایثار کرنا ہو گا۔ خلق خدا پر خدا کی طرف سے اتمامِ حجت کا حق تبھی ادا کیا جا سکے گا کہ وہ یہ

نہ کہہ سکے کہ اے اللہ تیرا پیغام ہم تک پہنچایا ہی نہیں گیا! یہ ہے وہ مقصد عظیم جس کے لئے اس شد و مد کے ساتھ اس آیت میں جہاد کی تاکید کی گئی : ﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾

بسم اللہ کرو، عمل کے میدان میں قدم رکھ دو!

اب ہم اس آیۂ مبارکہ کے آخری حصّے پر پہنچ گئے ہیں جس میں بڑے ہی عملی انداز میں یہ بات سامنے لائی گئی ہے کہ اگر بات سمجھ میں آگئی، اپنے فرائض دینی کا شعور حاصل ہو گیا ﴿ ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ ﴾ اور ﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ کے حوالے سے مطالباتِ دین کی چاروں سیڑھیاں اگر نگاہوں کے سامنے آ گئیں، تمہیں اگر معلوم ہو گیا کہ ایمان کا تقاضا کیا ہے تو بِسْمِ اللّٰهِ کرو! قدم بڑھاؤ اور عمل کا آغاز کر دو! نوٹ کیجئے یہاں گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے "ف" کے حرف سے، جیسے دو مرتبہ یہ کلمہ "فا" بڑے بامعنی انداز میں آیا ہے سورۂ تغابن میں۔ اسی طرح کا معاملہ یہاں ہے ﴿ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ بسم اللہ کرو، پہلی سیڑھی پر قدم رکھو، یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، سفر کا آغاز کر دو! فرائض دینی میں سے جو پہلا فرض ہے اُس کو تو پوری مضبوطی کے ساتھ پکڑو، اس پر تو کاربند ہو جاؤ!

یہاں دیکھئے وہ بات جو میں نے آغاز میں عرض کی تھی کہ "اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا" میں محض نماز کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ تمام ارکانِ اسلام مراد ہیں۔ چنانچہ یہاں اُسی نماز کی کوکھ سے زکوٰۃ برآمد ہو گئی۔ آگے فرمایا : ﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ﴾ اس پہلی سیڑھی پر قدم جما کر آئندہ کے مراحل کے لئے اللہ سے چمٹ جاؤ۔ عصمت کہتے ہیں حفاظت کو۔ اعتصام سے مراد ہے حفاظت کے لئے کسی سے چمٹ جانا۔ اصل میں یہاں تصویر لفظی ہے کہ کسی بچے کو اگر کہیں کسی طرف سے اندیشہ ہو، خوف لاحق ہو تو وہ اپنی ماں سے چمٹ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں قلعے میں آگیا ہوں اور ہر خطرے سے محفوظ ہو گیا ہوں۔ یہ ہے اعتصام۔ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ آئندہ کے مراحل کے لئے اللہ سے چمٹ جاؤ، اللہ کی حفاظت میں آجاؤ، اللہ ہی کو اپنا مددگار سمجھو، اللہ کی تائید و توفیق پر بھروسہ رکھو! منزلیں

بڑی کٹھن ہیں' ان فرائض کی ادائیگی آسان نہیں' ان میں سے ایک ایک سیڑھی بڑی ہی بھاری اور ایک پر ایک منزل بڑی کٹھن ہے' لیکن یہ کہ اللہ کا نام لے کر آغازِ سفر تو کرو ـــــ ﴿ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ﴾ نماز اور زکوٰۃ کے ذریعے بسم اللہ کرو' اور آئندہ کے لئے اللہ پر توکل کرو' اسی پر بھروسہ رکھو! ﴿ ھُوَ مَوْلٰکُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ۝ ﴾ "وہ تمہارا مولیٰ ہے' تمہارا مددگار ہے پس کیا ہی اچھا ہے وہ مددگار اور کیا ہی اچھا ہے وہ پشت پناہ!" جسے اُس کی حمایت میسر آجائے اب اس سے بڑھ کر کسی کو کس کی حمایت حاصل ہوگی! جس کو اس کی نصرت و تائید مل جائے اس سے بڑھ کر مطمئن اور بے فکر اور کون ہوگا!

"حبل اللہ" کی تعیین

یہاں ایک بات ذہن میں رہے کہ "وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ" کے الفاظ میں ایک اجمال ہے۔ قرآن مجید کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ (اَلْقُرْاٰنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا) تو وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ کی مزید شرح ہمیں سورۂ آل عمران میں ملے گی : ﴿ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ ﴾ اب یہاں دیکھئے کہ "حَقَّ تُقَاتِہٖ" میں لفظی مناسبت موجود ہے۔ "حَقَّ جِھَادِہٖ" اور "حَقَّ قَدْرِہٖ" کے اسلوب میں یہاں "حَقَّ تُقَاتِہٖ" کے الفاظ آئے ہیں۔ اگلی آیت میں فرمایا : ﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا ﴾ "اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو۔ گویا وہاں اللہ سے چمٹنے اور اس کے دامن سے وابستہ رہنے کے لئے اس کی رسّی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ہے۔ لیکن یہ سوال پھر باقی رہ گیا کہ اللہ کی وہ مضبوط رسّی کون سی ہے؟ اس سوال کا قرآن مجید میں جواب نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید کے اس اجمال کی مزید تفصیل ہمیں ملتی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمودات میں۔ اس لئے کہ قرآن حکیم کے کسی اجمال کی تفصیل اور تبیین کرنا نبی اکرم ﷺ کا صرف حق نہیں آپؐ کا فرضِ منصبی ہے۔ ﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ ﴾ "اور نازل کیا ہم نے یہ ذکر آپ کی طرف تاکہ اے نبی آپ توضیح کر دیا کریں (مزید وضاحت کر دیا کریں) اُس کی کہ جو لوگوں کے لئے نازل کیا گیا"۔ چنانچہ مذکورہ بالا سوال کا جواب ہمیں نبی اکرم ﷺ

کے ایک فرمان میں ملتا ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ وہ ایک طویل روایت ہے جس میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے۔ اسی میں یہ الفاظ بھی آپؐ نے ارشاد فرمائے : هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ ! یہ قرآن ہے اللہ کی مضبوط رسّی!

سلسلۂ مضمون کو ذہن میں جوڑ لیجئے! "وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ" کی شرح مزید ہوئی "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ" کے الفاظ سے۔ اور وہ حبل اللہ کون سی ہے؟ اس کا جواب ملا حدیثِ نبویؐ کے ذریعے کہ "هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ" اس سے اشارہ ہو گیا کہ اس سارے عمل یعنی مجاہدہ فی سبیل اللہ اور شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لئے مرکز و محور دراصل قرآن مجید ہو گا۔ یہ مضمون ہمارے منتخب نصاب کے اسی جزو میں سورۃ الجمعہ کے ضمن میں تفصیل سے زیر بحث آئے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○

قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس بذریعہ CD

قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس جو بذریعہ کتب و کیسٹ کروایا جاتا ہے' اس کے ساتھ ساتھ اب یہ کورس اللہ کی تائید و نصرت سے بذریعہ "CD" بھی کروایا جائے گا۔ یعنی کورس میں شامل 44 کیسٹ بھیجنے کی بجائے' ایسے افراد جن کے پاس کمپیوٹر کی سہولت ہو' انہیں "CD" بھیجی جائے گی۔ بذریعہ "CD" کورس کرنے کی صورت میں کورس کی فیس =/450 روپے ہو گی۔ داخلہ فارم پُر کرتے وقت یہ لکھنا ہو گا کہ ہم یہ کورس بذریعہ "CD" کرنا چاہتے ہیں۔

مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کیجئے :

شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی 36 کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون : 03-5869501

خدمت خلق کی اہمیت

تعلیماتِ نبویؐ کے حوالہ سے

محمد امجد تھانوی ☆

اس دُنیا میں آپ کو ایسے انسان بھی ملیں گے جن کے سامنے صرف اپنی ذات ہوتی ہے' وہ ہر کام میں اپنا مفاد دیکھتے ہیں' کسی دوسرے کے مفاد سے انہیں دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ ہر ایک سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں' لیکن کسی کے کام آنا نہیں چاہتے۔ کسی کے دکھ درد اور مصیبت سے انہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی اور کسی کی خدمت کا جذبہ ان میں نہیں ابھرتا۔ اگر اُبھرتا بھی ہے تو اسے مختلف بہانوں سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کی زندگی کا مطمح نظر فقط اپنے لئے جینا اور اپنے مقاصد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں میں خدمت کا جذبہ فقط اپنے خاندان یا قبیلہ تک محدود ہوتا ہے' لیکن اسلام انسان پر اس کے خاندان اور قبیلہ کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی بھی ذمہ داری ڈالتا ہے' اس لئے کہ اسلام کے ماننے والے تمام افراد ایک امت ہیں اور ایک جسم کی مانند ہیں' جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محسن انسانیت ﷺ نے فرمایا :

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ))[1]

"باہمی محبت' ایک دوسرے کے لئے جذبۂ رحمت اور باہم میل جول میں اہل ایمان کی مثال ایک جسم کی سی ہے"۔

یعنی تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ جس طرح جسم کے کسی ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم اس کو محسوس کرتا ہے' اسی طرح ہر مسلمان کو معاشرہ کے ہر مسلمان کے مسائل و مصائب کو حل کرنے سے دلچسپی ہونی چاہئے۔ اس عمل کی فضیلت بیان کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ فرمایا :

☆ ریسرچ سکالر کلیہ معارفِ اسلامیہ' جامعہ کراچی

(مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ' وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ' وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ)) (۲)

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا) "جو شخص دُنیا میں کسی مسلمان کی تکالیف میں سے کوئی تکلیف دور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی تکلیفوں میں سے اس کی تکلیف دور کرے گا۔ اور جو کوئی مشکلات میں گھرے کسی مسلمان کے لئے آسانی پیدا کرے گا اللہ دُنیا و آخرت میں اس کے لئے آسانی پیدا کرے گا' اور جب تک انسان اپنے مسلم بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے اللہ تعالیٰ مدد کرنے والے کی مدد کرتا رہتا ہے۔"

خدمت خلق کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی خدمت کے مثل قرار دیا ہے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

"قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسان سے کہے گا : اے ابنِ آدم! میں بیمار پڑا لیکن تو نے میری عیادت نہیں کی۔ انسان گھبرا کر عرض کرے گا : اے میرے رب! تو سارے جہاں کا پروردگار' تو کب بیمار تھا اور میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا : کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے' لیکن اس کے باوجود تو اس کی مزاج پرسی کے لئے نہیں گیا۔ اگر تو اس کے پاس جاتا تو مجھے وہاں پاتا۔ پھر خدائے تعالیٰ فرمائے گا : اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں دیا۔ انسان عرض کرے گا : اے رب العالمین! تو کب بھوکا تھا اور میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا : کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا' لیکن تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تو نے اس کا سوال پورا کیا ہوتا تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرمائے گا : اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تو نے مجھ کو پانی نہیں پلایا۔ انسان عرض کرے گا : اے تمام جہانوں کے پروردگار! تو کب پیاسا تھا' اور میں تجھے پانی کیسے پلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا : میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا' لیکن تو نے اس کی پیاس بجھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر تو نے اس کی پیاس بجھائی ہوتی تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا۔"

اس سے اندازہ لگائیے کہ بندے کی خدمت خدا کی خدمت کی طرح ہے اور اس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں' جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا :

((اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عَيَالُ اللّٰهِ' اَحَبُّهُمْ اِلَيْهِ اَنْفَعُهُمْ لِعَيَالِهِ)) (۳)

"مخلوق ساری کی ساری اللہ کا کنبہ ہے' اس میں وہ شخص اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کو زیادہ نفع پہنچائے۔"

قرآن مجید نے مسکینوں' محتاجوں' معذوروں' یتیموں اور وسائل سے محروم انسانوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا عام حکم دیا ہے۔ کہیں بھی اس نے یہ ہدایت نہیں کی کہ صرف مسلمانوں یا انسانوں کے کسی خاص گروہ اور جماعت کی خدمت کی جائے اور دوسروں کی نہ کی جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدمت پوری نوعِ انسانی کی ہو' اپنوں کی بھی اور غیروں کی بھی' ہم خیال اور ہم عقیدہ افراد کی بھی' اور ان لوگوں کی بھی جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ بھی اس کے مستحق ہیں جو ہماری زبان بولتے ہیں اور وہ بھی جن کے اظہارِ خیال کا ذریعہ دوسری زبان ہے۔ نوعِ انسانی کا ہر فرد اس بات کا حق رکھتا ہے کہ آلام و مصائب میں اسے تنہا تڑپتے نہ چھوڑ دیا جائے' بلکہ اس کے درد و کرب کو محسوس کیا جائے اور امکان کی حد تک اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لئے کہ رنگ' نسل' قوم اور وطن کے فرق کے باوجود ؎

بنی آدم اعضاء یک دیگر اند کہ در آفرینش زیک جوہر اند

اسلام کی یہ تعلیمات مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں' بلکہ پچھلی امتوں کو بھی یہی تعلیم دی گئی تھی۔ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ سے پہلے کے بہت سے پیغمبروں اور ان کی تعلیمات کے بکثرت حوالے دیئے گئے ہیں۔ ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل کے اسرائیلی پیغمبروں کا ذکر کسی قدر تفصیل سے آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ان پیغمبروں نے بنی اسرائیل سے انسانوں کے حقوق پہچاننے' ان کی خدمت کرنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا بھی عہد لیا تھا۔ اس عہد کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

﴿ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْ اِسْرَاءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ

اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ط ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ○ وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ○

(البقرۃ : ۸۳،۸۴)

"یاد کرو! جب ہم نے بنی اسرائیل سے یہ پختہ عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو گے اور (اسی طرح) قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ (حسن سلوک کرو گے) اور عام لوگوں کے ساتھ اچھی طرح بات کرو گے، نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ دو گے، لیکن سوائے چند ایک کے تم سب اس سے پھر گئے۔ اور یہ بھی یاد کرو کہ ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور اپنے لوگوں کو اپنے گھروں سے نکال کر بے گھر نہ کرو گے، پھر تم نے اس کا اقرار بھی کیا تھا اور تم اس کی شہادت بھی دیتے ہو۔"

یہ آیات صراحت کرتی ہیں کہ بنی اسرائیل سے ایک تو اللہ واحد کی عبادت اور انسانوں کے ساتھ حسن سلوک کا عہد لیا گیا تھا، دوسرا عہد یہ تھا کہ ان کا دامن ہمیشہ ظلم و زیادتی سے پاک رہے گا۔ حسن سلوک کا ظلم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے۔ انسانوں کی خدمت کا جذبہ بے رحمی اور شقاوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ جو شخص دوسروں کا خون بہاتا پھرے وہ ان کے زخموں کے لئے مرہم نہیں فراہم کرے گا۔ اسی طرح خدمت کرنے والا ہاتھ جور و ستم کے لئے نہیں اٹھے گا۔ یہ مختلف کردار ہیں اور مختلف جذبات کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ خدمت سے قوموں کی زندگی وابستہ ہے اور ظلم نے بڑی بڑی جابر اور سرکش قوموں کی کمر اس طرح توڑ کر رکھ دی کہ ان میں بہت سی قوموں کو پھر اٹھنا نصیب نہیں ہوا۔

ہر شخص پر حسبِ استطاعت خدمتِ خلق لازم ہے

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس کی استطاعت کے مطابق مکلف بنایا ہے، جتنی

استطاعت ہو اتنی ہی خدمت کرے۔ خدمت کے تصور کے ساتھ عموماً بڑی بڑی خدمات ذہن میں آتی ہیں' جبکہ ان کو ادا کرنے کا یارا ہر شخص اپنے اندر نہیں پاتا اور چھوٹی موٹی خدمات جنہیں انسان آسانی سے انجام دے سکتا ہے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس طرح نہ بڑی خدمات انجام پاتی ہیں اور نہ چھوٹی۔ حدیث میں اس ذہن کی اصلاح کی گئی ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنے متعدد ارشادات میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ نوعِ انسانی کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی جو خدمت بھی کی جاسکتی ہے کی جانی چاہئے' ہر خدمت صدقہ اور احسان ہے اور انسان اس پر اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ اس سلسلہ کی بعض حدیثیں یہاں پیش کی جارہی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((كُلُّ سُلَامَى مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيهِ الشَّمْسُ))

"جب ہر روز سورج طلوع ہوتا ہے تو آدمی کے جوڑ جوڑ پر صدقہ واجب ہو جاتا ہے"

لیکن صدقہ مال ہی کا نہیں ہوتا' بلکہ اسکی اور صورتیں بھی ہیں۔ اسکی وضاحت آپ نے اس طرح فرمائی :

((يَعْدِلُ بَيْنَ الْاِثْنَيْنِ صَدَقَةٌ ' وَيُعِيْنُ الرَّجُلَ عَلٰى دَابَّتِهٖ فَيَحْمِلُ عَلَيْهَا اَوْ يَرْفَعُ عَلَيْهَا مَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ ' وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ ' وَكُلُّ خُطْوَةٍ يَخْطُوْهَا اِلَى الصَّلَاةِ صَدَقَةٌ ' وَيُمِيْطُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ)) (۴)

"کوئی شخص دو آدمیوں کے درمیان انصاف کر دے یہ بھی صدقہ ہے' کسی کو جانور پر سوار ہونے میں مدد دے یہ بھی صدقہ ہے' سواری پر کسی کا سامان رکھ دے یا اُتار دے یہ بھی صدقہ ہے' زبان سے اچھی بات کرے یہ بھی صدقہ ہے' اسی طرح نماز کے لئے جو قدم اٹھائے وہ بھی صدقہ ہے' راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کو دور کر دے یہ بھی صدقہ ہے"۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے' فرماتے ہیں :

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((تَبَسُّمُكَ فِيْ وَجْهِ اَخِيْكَ لَكَ صَدَقَةٌ ' وَاَمْرُكَ بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهْيُكَ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ '

وَاِرْشَادُكَ الرَّجُلَ فِي الْاَرْضِ الضَّلَالِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَاِمَاطَ الْحَجَرَ وَالشَّوْكَ وَالْعَظْمَ عَنِ الطَّرِيْقِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَاِفْرَاغُكَ مِ دَلْوِكَ فِي دَلْوِ اَخِيْكَ لَكَ صَدَقَةٌ)) (۵)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا صدقہ ہے، تمہارا معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا صدقہ ہے، تمہارا جنگل و بیابان میں، جہاں راستہ کا پتہ نہ چلے، کسی کو راستہ دکھانا صدقہ ہے، تمہارا راستہ سے پتھر، کانٹے اور ہڈی (جیسی تکلیف دہ چیزوں) ہٹا دینا صدقہ ہے، تمہارا اپنے ڈول سے پانی بھر کر اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا صدقہ ہے۔ (یہ سب صدقات ہیں، ان میں سے ہر ایک کا تمہیں ثواب ملے گا۔)"

ان حدیثوں میں انسانوں کی خدمت اور ان کی بھلائی کی بہت سی صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں کہ خدمت کا جذبہ ہو تو بڑی آسانی سے ان پر عمل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک روایت حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم دونوں سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ)) (۶)

"بھلائی کا ہر کام صدقہ ہے۔"

یہ ایک جامع حدیث ہے جو خدمت خلق کی سب ہی شکلوں پر حاوی ہے۔ بنی نوع انسان کی جس شکل میں بھی خدمت کی جائے وہ اس پر صدقہ و احسان ہے اور خدمت کرنے والا اس کے اجر و ثواب کا مستحق ہے، بس نیت ثواب کی ہونی چاہئے۔

صدقہ و خیرات کا کار خیر ہونا ہر شخص پر واضح ہے، اس کی اہمیت و افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انسانوں کی خدمت اور ان کی بھلائی کے ہر کام کو صدقہ قرار دے کر اس کی عظمت دلوں میں بٹھا دی گئی ہے۔ مزید ہدایت یہ کی گئی ہے کہ بھلائی کے کسی چھوٹے سے عمل کو بھی حقیر سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے، اس لئے کہ خلق خدا کو جو فائدہ بھی پہنچایا جا سکتا ہے اس سے ہاتھ روک لینا صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئًا وَلَوْ اَنْ تَلْقٰى اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلِيْقٍ)) (۷)
بھلائی کے کسی کام کو حقیر ہرگز نہ سمجھو اگرچہ وہ تمہارا اپنے بھائی سے مسکرا کر ملنا ہی کیوں نہ ہو"۔

انسانوں کی خدمت جس پہلو سے اور جتنی کچھ بھی ہو سکتی ہے ضرور کی جانی چاہئے' یہ عذاب جہنم سے نجات کا بہت بڑا ذریعہ بھی ہے۔

((عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :
((. . . تُعِيْنُ ضَائِعًا اَوْ تَصْنَعُ الاَخْرَقَ)) قُلْتُ : فَاِنْ لَمْ اَفْعَلْ؟ قَالَ :
((تَدَعُ النَّاسَ مِنَ الشَّرِّ فَاِنَّهَا صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ بِهَا عَلٰى نَفْسِكَ)) (۸)
حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ". . . اس شخص کی مدد کرو جس کے بچے غربت سے ضائع ہو رہے ہوں یا جو شخص اپنا کام نہ کر سکے۔ میں نے عرض کیا : اگر یہ بھی نہ کر سکوں؟ آپ نے فرمایا : لوگوں کو (اپنے ہی) شر سے بچاؤ' یہ بھی ایک صدقہ ہے جو تم اپنے نفس پر کرو گے"۔

اس حدیث میں پہلے ایمان باللہ' جہاد فی سبیل اللہ اور غلاموں کو آزاد کرنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا : ((تُعِيْنُ ضَائِعًا اَوْ تَصْنَعُ الاَخْرَقَ)) اسی کی یہاں تھوڑی سی تشریح کی جائے گی۔ "تعین ضائعا" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص غربت میں مبتلا ہو اور جس کے بیوی بچوں کے گزر بسر کی صورت نہ ہو اس کی مدد کرو' اسے ضائع ہونے سے بچاؤ۔ اور اس مدد کی مقدار یا اس کی شکل متعین نہیں کی گئی ہے' اسے اس شخص کے حالات اور مدد کرنے والے کی حیثیت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ احتیاج جس نوعیت کی ہے اسی نوعیت کی مدد آدمی کو اپنی حیثیت کے مطابق کرنی چاہئے۔

ایک روایت میں "ضَائِعًا" کی جگہ "صَانِعًا" کا لفظ آیا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی ایسے شخص کی مدد کرو جس کے ہاتھ میں کوئی صنعت یا پیشہ ہے' اس کی مدد روپیہ پیسہ' فنی تعاون' اوزار اور مشینوں کی فراہمی اور پیداوار کے لئے بازار اور مارکیٹ پیدا کر کے کی جا سکتی ہے۔ اصحابِ حرفت کی مدد کا ذکر خصوصیت سے اس لئے کیا گیا ہے کہ ان

کی مشکلات کا بالعموم احساس نہیں ہوتا اور ان کی مدد کی طرف ذہن نہیں جاتا۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا "او تصنع الاخرق" آخرق بے ہنر کو یا ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو کوئی کام اچھی طرح نہ کر سکے۔

گویا پہلے ہنرمند کی مدد کا حکم ہوا' پھر بے ہنر کی طرف توجہ دلائی گئی۔ مطلب یہ کہ جو شخص بے ہنر ہے یا اپنا کام ٹھیک سے انجام نہیں دے پا رہا ہے اس کی مدد کی جائے۔ اگر معاشرہ میں اس کا احساس عام ہو اور اس طرح کے ادارے کام کرنے لگیں جہاں صنعت و حرفت کی تعلیم دی جائے' بے ہنروں کو ہنرمند بنایا جائے اور ان کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کئے جائیں تو یہ خدمت خلق کی بہت اچھی شکل ہو سکتی ہے اور اس سے کمزور طبقات کے معاشی مسائل بڑی حد تک حل ہو سکتے ہیں' بالخصوص کراچی کے جیسے حالات ہیں اس میں اگر کچھ مخیر حضرات بے روزگاروں کی مدد پر آمادہ ہو جائیں تو تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

نوجوانوں اور ضرورت مندوں کی رہنمائی بھی خدمت ہے

انسان قدم قدم پر اچھے مشورے کا محتاج ہوتا ہے۔ تعلیم' صنعت و حرفت' تجارت' زراعت' سفر' مرض' صحت' غرضیکہ زندگی کے بہت سے معاملات میں اسے مشورے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ موجودہ دور کے قوانین اور ضابطوں نے ہر معاملے میں اتنی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں کہ آدمی اسکے تمام پہلوؤں سے کماحقہ' واقف نہیں ہو پاتا۔ بعض اوقات صحیح مشورہ نہ ملنے کی وجہ سے بڑی زحمتیں اور نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ اسی وجہ سے مختلف مسائل میں مشورہ دینے کیلئے آج بڑے بڑے ادارے قائم ہیں۔ حدیث میں کسی کو بروقت صحیح اور ٹھیک مشورہ دینے کی فضیلت آئی ہے' ایک حدیث میں ہے :

((مَنْ دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِهٖ)) (۹)

"جس نے کسی خیر کی طرف راہنمائی کی تو اسے اس پر عمل کرنے والے کے برابر ثواب ملے گا۔"

اسی طرح جانتے بوجھتے اور دیدہ و دانستہ غلط مشورہ دینے کو خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((مَنْ اُفْتِیَ بِغَیْرِ عِلْمٍ کَانَ اِثْمُهٗ عَلٰی مَنْ اَفْتَاهُ وَمَنْ اَشَارَ عَلٰی اَخِیْهِ بِاَمْرٍ یَعْلَمُ اَنَّ الرُّشْدَ فِیْ غَیْرِهٖ فَقَدْ خَانَهٗ)) (۱۰)

"جس شخص کو بغیر علم کے فتویٰ دیا گیا (اور اس نے اس پر عمل کیا) تو گناہ اس شخص پر ہو گا جس نے فتویٰ دیا اور جس نے اپنے بھائی کو یہ جانتے ہوئے کسی بات کا مشورہ دیا کہ اس کا فائدہ اور بھلائی دوسری بات میں ہے تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔"

موجودہ تہذیب و تمدن نے جو مسائل پیدا کر دیئے ہیں وہ بڑے پیچیدہ ہیں، لیکن ہمارے یہاں ایسے ادارے نہیں ہیں جو ان کے سلسلے میں صحیح رہنمائی کریں اور جدید اسباب و وسائل سے فائدہ اٹھانے کی تدبیریں بتائیں اور اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر واضح کریں۔ نہ ہی ہماری مذہبی و سیاسی جماعتوں نے اس طرف توجہ دی ہے، حالانکہ اس میں سوائے وقت کے اور کچھ صرف نہیں ہوتا۔

تعلیمی اداروں کا قیام اور ان کی سرپرستی و معاونت بھی خدمت ہے

قوموں کی ذہنی اور فکری تعمیر میں تعلیم بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لہٰذا قوم کے نونہالوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے ہر سطح پر تعلیمی اداروں کا قیام اور سرپرستی و معاونت بھی ایک قومی خدمت ہے جو اصحاب خیر کی توجہ کی طالب ہے۔

کسی قوم میں جو رفاہی خدمات انجام دی جاتی ہیں ان میں تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام نے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اس کے فروغ کی پوری کوشش کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی توسیع و اشاعت کو ایک دینی فریضہ قرار دیا اور ہدایت فرمائی کہ جو شخص دین کا جتنا کچھ بھی علم حاصل کرے اسے دوسروں تک پہنچائے۔ موجودہ دور میں علم کے فروغ کا بڑا ذریعہ تعلیمی ادارے اور درس گاہیں ہیں۔ یہیں سے وہ افراد تیار ہوتے ہیں جو علم و فن، تہذیب و تمدن اور معیشت و سیاست کے مختلف شعبوں کو چلاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس طرح کے ادارے الگ سے تو نہیں تھے البتہ مساجد سے علم کی روشنی چاروں طرف پھیلتی تھی۔ وہاں تعلیمی مجلسیں ہوتی تھیں، علمی

حلقے قائم تھے اور درس و تدریس کا فرض انجام پاتا تھا۔ بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے تعلیمی ادارے قائم کئے جہاں خالص دینی علوم کے ساتھ ساتھ ان کی روشنی میں وقت کے افکار و نظریات کی بھی تدریس ہوتی تھی۔ ان اداروں نے امت کے بہت سے مفکرین اور مجتہدین پیدا کئے۔ انہی مفکرین و علماء کی بدولت اسلام ہم تک اصلی حالت میں پہنچا ہے۔ لیکن علمی خدمات کے ساتھ جسمانی خدمات کی بھی ضرورت ہے۔

شفاخانوں کا قیام بھی خدمت ہے

جسمانی خدمت کے حوالہ سے واضح ہو کہ اسلام سے پہلے عرب میں لوگ اپنا علاج خود کرتے یا کراتے تھے۔ یہ ایک لحاظ سے ہر شخص کا ذاتی یا زیادہ سے زیادہ اس کا خاندانی مسئلہ تھا جسے وہ اپنی طاقت اور وسائل کے لحاظ سے حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ عوامی شفاخانوں یا ہسپتالوں کا وجود نہیں تھا۔ اسلام کے آنے کے بعد بھی عرصہ تک یہی صورت حال رہی، لیکن اسلام نے خدمت کا جو جذبہ پیدا کیا اس کے نتیجہ میں یوں کہنا چاہئے کہ اس طرح کے شفاخانوں کی بھی بنیاد پڑ گئی۔ شفاخانے اور ہسپتال قومی خدمت کی ضرورت کو چونکہ مستقل طور پر پورا کرتے ہیں اس لئے اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کا ان کی تعمیر و ترقی میں بڑا حصہ رہا ہے، اور یہ خدمت ایسی ہے جس میں مردوں کے علاوہ خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

خدمت خلق کی بہترین شکل وقف ہے

لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم مال کو اللہ کی امانت سمجھ کر خرچ کریں۔ رفاہی کاموں کے لئے زمین جائیداد اور اپنی قیمتی چیزوں کے وقف کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ ان کاموں کو جاری رکھنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی ہے اور وقف کرنے والے کے لئے صدقہ جاریہ بھی۔ صدقہ جاریہ سے متعلق بعض روایات اس سے پہلے گزر چکی ہیں، یہاں ایک اور حدیث پیش کی جا رہی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ : صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ اَوْ

عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْلَهٗ)) (۱۱)

"جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے' البتہ تین صورتیں ایسی ہیں جن میں اس کے اعمال باقی رہتے ہیں اور اسے ثواب ملتا رہتا ہے۔ وہ یہ ہیں : صدقہ جاریہ' اس کا وہ علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور صالح اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی رہتی ہے۔"

ماحصل

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص پر خدمت خلق حسب استطاعت لازم ہے۔ ہر شخص کو اپنے عمل کا تجزیہ کرنا چاہئے۔

مراجع ومصادر

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الادب' باب رحمة الناس والبهائم۔ صحیح مسلم' کتاب البر والصلة' باب تراحم المومنین وتعاطفهم

۲۔ صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء' باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن و علی الذکر' وابوداؤد' کتاب الادب' باب فی معونة المسلم

۳۔ البیهقی' شعب الایمان' بحواله مشکوٰة المصابیح' کتاب الادب' باب الشفقة والرحمة علی الخلق

۴۔ متفق علیه' بحواله مشکوٰة المصابیح' کتاب الزکوٰة' باب فضل الصدقة

۵۔ جامع الترمذی' کتاب البر والصلة' باب ماجاء فی صنائع المعروف

۶۔ صحیح البخاری' کتاب الادب' باب کل معروف صدقة' و صحیح مسلم' کتاب الزکوٰة' باب ان اسم الصدقة یقع علی کل معروف

۷۔ صحیح مسلم' کتاب البر والصلة' باب استحباب طلاقة الوجه عند اللقاء

۸۔ متفق علیه' بحواله مشکوٰة المصابیح' کتاب العتق

۹۔ صحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضل اعانة الغازی فی سبیل الله ....

۱۰۔ سنن ابی داؤد' کتاب العلم' باب التوقی فی الفتیا

۱۱۔ صحیح مسلم' کتاب الوصیة' باب مایلحق الانسان من الثواب بعد وفاته

امام ابو یعلیٰ موصلی رحمۃ اللہ علیہ

—— عبدالرشید عراقی ——

امام ابو یعلیٰ احمد بن علی بن مثنیٰ بن یحییٰ بن عیسیٰ بن ہلال ۲۰۷ھ میں موصل میں پیدا ہوئے۔

ان کے اساتذہ میں امام احمد بن حنبل اور امام یحییٰ بن معین رحمہما اللہ شامل ہیں، جبکہ تلامذہ میں امام ابو بکر اسمٰعیل، ابو حاتم اور امام ابو علی نیشاپوری جیسے صاحب علم و فضل کے نام ملتے ہیں۔

پندرہ سال کی عمر میں طلب حدیث کے لئے سفر کیا اور مختلف اسلامی شہروں میں علمائے فن سے استفادہ کیا۔

امام ابو یعلیٰ مشہور حفّاظِ حدیث اور نامور محدّثین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اپنے غیر معمولی حافظہ کی بناء پر "الحافظ المشہور" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ محدثین کرام اور علمائے فن نے ان کے حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت کا اعتراف کیا ہے اور ان کو ثقہ و ثابت اور متقن لکھا ہے۔

حافظ ابنِ کثیر فرماتے ہیں :

"امام ابو یعلیٰ موصلی اپنی مرویات میں ثقہ و عادل اور احادیث میں حافظ و ضابط تھے۔" (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۳۰)

امام ابو یعلیٰ تدیّن و تقویٰ میں عالی مرتبہ اور فضائل اخلاق سے آراستہ تھے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ امام ابو یعلیٰ موصلی صدق و دیانت، حلم و تقویٰ و طہارت اور دوسرے تمام اوصاف و کمالات کے جامع تھے۔ حافظ ابن کثیر نے ان کو صاحب خیر اور صاحب شذرات الذہب نے صالح بتایا ہے۔

امام ابو یعلیٰ کو اپنے حسنِ نیت اور اخلاص کی برکت کی وجہ سے بڑی شہرت و

مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی ذات عوام و خواص کی عقیدت کا مرکز بن گئی۔ ان کے انتقال کے دن موصل کے بازار بند ہو گئے تھے اور لوگوں کا جمِ غفیر ان کے جنازہ میں شریک تھا۔ امام ابو یعلیٰ نے تقریباً سو سال کی عمر میں ۳۰۷ھ میں اپنے وطن موصل میں وفات پائی۔

تصانیف

امام ابو یعلیٰ موصلی صاحب تصانیف تھے۔ حافظ ابنِ کثیر لکھتے ہیں کہ وہ عمدہ اور بہتر تصانیف کے مالک تھے۔

ان کی تین کتابوں کے نام تاریخ نے محفوظ کئے ہیں۔

۱۔ معجم : حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی لکھتے ہیں کہ :

"امام ابو یعلیٰ موصلی نے یہ کتاب ترتیب شیوخ پر مرتب فرمائی۔ اس میں امام صاحب نے اپنے ۲۷۴ شیوخ کی مرویات کا ذکر کیا ہے۔"

یہ کتاب مشہور اہلحدیث عالم اور محقق مولانا ارشاد الحق اثری کی تحقیق و تخریج سے ۱۴۰۷ھ میں ادارۃ العلوم فیصل آباد نے شائع کر دی ہے اور اس کے مقدمہ میں مولانا ارشاد الحق اثری نے امام ابو یعلیٰ کے مزید ۱۲ شیوخ کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۔ ۳ مُسند کبیر، مُسند صغیر : امام ابو یعلیٰ نے دو مسندیں مرتب فرمائیں، ایک کبیر اور دوسری صغیر۔

مشہور مسند صغیر ہے اور ۳۶ اجزاء پر مشتمل ہے۔ اس کا شمار حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس میں ثلاثی حدیثیں بھی ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس کو طبقات کتب حدیث میں تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے۔

اس کی اہمیت کی وجہ سے علمائے فن نے اس کے ساتھ بڑا اعتناء کیا ہے۔ حافظ ابنِ کثیر (م ۷۷۴ھ) نے "جامع المسانید والسنن" میں اور امام محمد بن سلیمان (م ۱۰۹۴ھ) نے "جمع الفوائد من جامع الاصول و مجمع الزوائد" میں اس کی حدیثیں درج کی ہیں۔

نور الدین ہیثمی نے اس کے زوائد مرتب کئے۔ حافظ ابنِ حجر نے "اتحاف المھرہ"

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

عدم برداشت کا قومی و بین الاقوامی رجحان اور تعلیماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (۲)

تحریر : پروفیسر عبدالماجد، مانسہرہ

۴ میدانِ جنگ میں بھی برداشت کا حکم

اسلام نے جنگ کی اجازت دو صورتوں میں دی ہے، ایک یہ کہ مسلمانوں پر اِس حد تک ظلم کیا جائے کہ وہ بنیادی حقوق (۳۰) سے محروم ہو جائیں (یعنی انسان کی جان، مال، عزت، نسل، دین اور فکر و عقل کا تحفظ نہ ہو سکے)، دوسرے یہ کہ ان کے دین کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول جنگ کے سلسلہ میں اسلام کی روح کو کامل طور پر ظاہر کرتا ہے :

"ولقد كانت حربهم لاطمينان على امرين : ديارهم من تغزوا ودينهم من ان يطمس" (۳۱)

"مسلمانوں کی دشمنوں سے جنگ دو باتوں کے اطمینان کے لئے ہوتی ہے، ایک یہ کہ ان کی بستیوں پر کوئی جنگ نہ مسلط کر دی جائے اور دوسرے یہ کہ ان کے دین کو مٹانے کی کوشش نہ کی جائے"۔

اس طرح اسلامی جنگ ظلم کے خاتمے، مظلوموں کی حمایت اور تمام مذاہب کے مقاماتِ عبادت کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ (۳۲) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور تعلیمات بھی اس پر شاہد ہیں کہ میدانِ جنگ میں پہلے مخالفین کو اسلام کی دعوت دی جاتی تھی، اگر وہ قبول نہ کرتے تو جزیہ کی قبولیت کے ساتھ جنگ روک لی جاتی، اور اگر یہ دونوں باتیں فریق مخالف قبول نہ کرتا تو پھر جنگ شروع کی جاتی، کیونکہ :

لِاَنَّ الْاِسْلَامَ يَدْعُوْ اِلَى السَّلَامِ وَلَا يَقْبَلُ الْاِسْتِسْلَامَ بِالْبَاطِلِ وَالْاِسْتِسْلَامَ فِى الْخُضُوْعِ لِلْبَاطِلِ (۳۳)

"بے شک اسلام امن کا خواہاں ہے' لیکن باطل کے ساتھ جھکنا اور باطل کی فرماں برداری قبول نہیں کر سکتا"۔

اس طرح اگر جنگ کے دوران بھی فریق مخالف صلح کے لئے تیار ہو جائے تو اس کی پیشکش کو قبول کرتے ہوئے صلح کر لینے کی ہدایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس پر شاہد ہے کہ مکّہ کے تیرہ سالوں میں مشرکین کی تمام تکالیف کو آپؐ اور صحابہؓ نے جھیلا' لیکن جنگ کی صورت نہیں پیدا ہونے دی' اور ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں فتنہ و فساد سے بچنے کے لئے ابتدائی طور پر یہودِ مدینہ سے معاہدۂ امن کر لیا اور بعد کی جتنی جنگیں ہوئیں وہ یا تو اپنے دین و ایمان اور مسلمانوں کو کسی خطرہ سے بچانے اور ان کے بنیادی حقوق کی حفاظت کے لئے تھیں یا پھر اللہ کے دین کے غلبے اور سربلندی کے لئے۔

عام طور پر دُنیا کی جنگوں میں کوئی ضابطۂ اخلاق نہیں ہوتا' بلکہ جنگ میں ہر چیز جائز سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اسلامی جہاد (قتال) نفسانیت یا توسیع پسندی کے لئے نہیں۔ اس لئے اسلام نے جنگ کے دوران بھی اخلاقی قدروں کے لحاظ کا حکم دیا اور ہر قسم کے ظلم سے منع کیا ہے۔ بچوں' عورتوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے' لوٹ مار اور مُثلہ کرنے سے منع کیا' سفراء اور قاصدوں کو امان دینے کا حکم دیا' اسیروں سے نیک سلوک کی تلقین کی (۳۳) اور مخالفین کی دشمنی کی وجہ سے عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے کا حکم دیا۔

اسلام کی انہی تعلیماتِ صبر و برداشت کی بدولت عہد نبویؐ کے کُل غزوات و سرایا میں صرف ۲۵۹ مسلمان شہید ہوئے' ۷۱۲ زخمی ہوئے' مخالفین کے ۷۵۹ افراد قتل ہوئے اور ۶۵۶۴ افراد قید ہوئے۔ ۶۳۴۷ کے بارے میں صاف معلوم ہے کہ حضور ﷺ نے انہیں از راہِ لطف و احسان بلا کسی شرط کے آزاد کر دیا۔ (۳۵)

اس کے مقابلے میں داعیانِ امن و سلامتی کی رزم گاہوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ چند جنگوں میں لاکھوں کروڑوں انسان موت کے گھاٹ اتارے گئے' مثلاً تیس سالہ جنگ' جس میں فرانس' آسٹریا اور سویڈن وغیرہ نے حصہ لیا اور ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء تک جاری رہی' اس میں صرف جرمنی کے ایک کروڑ بیس لاکھ افراد مارے گئے۔ پہلی

جنگ عظیم میں ایک کروڑ افراد مارے گئے' ۲ کروڑ مجروح ہوئے اور بعد میں جنگ کی تباہ کاریوں کی وجہ سے کئی لاکھ افراد مر گئے' اور ایک ہزار بلین امریکی ڈالر کا مال و اسباب تباہ ہوا۔ (۳۶)

۵ انسدادِ فساد کے لئے حقوق کا تعین

ان تعلیمات کے علاوہ حضور اکرم ﷺ نے معاشرے کو فتنہ و فساد سے بچانے کے لئے ہر ایک کے حقوق متعین کر دیئے۔ چونکہ مسلمان دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے اور یہاں اس نے اس کے احکامات کو نافذ کر کے امن و سلامتی کا دور دورہ کرنا ہے' اس لئے مسلمانوں کے آپس میں تعلقات کا درست ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اور آپؐ نے مسلمانوں کے تعلقات کی درستی کے لئے بڑی تفصیلی ہدایات دی ہیں۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیا ہے اور سب سے اچھا مسلمان اس کو کہا ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ مسلمان کی عزت و آبرو کی طرف ہاتھ بڑھانے کو سب سے بڑا ربا (سود) قرار دیا ہے۔ کسی مسلمان کے ساتھ تین دن سے زائد قطع تعلق کو ناجائز و حرام کہا ہے۔ مسلمانوں کے قتل پر اللہ کے غضب اور جہنم کا مستحق ٹھہرایا۔ کسی مسلمان کے قتل کو ساری دنیا کے زوال سے بڑا وبال قرار دیا۔

آپس میں کینے' بغض اور حسد کو سختی سے منع فرمایا :

((لَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ' وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا)) (۳۷)

"آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو' آپس میں کسی ایک کو دوسرے کے خلاف مت بھڑکاؤ' اور آپس میں بغض نہ رکھو' نہ آپس میں پیٹھ پیچھے بُرائی کرو اور نہ کوئی کسی کی بیع پر بیع کرے' اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ"۔

خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا :

"لوگو! تمہارے خون' تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں جیسا کہ آج کے دن تم اس شہر اور اس مہینہ کی حرمت کرتے ہو ـــــ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو"۔ (۳۸)

اور یہ بھی فرمایا :

((اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ ' لاَ یَظْلِمُهٗ وَلاَ یُسْلِمُهٗ)) (۳۹)

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے ' نہ تو اس پر ظلم کرے ' نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑے"۔

اور فرمایا :

((اَنَا زَعِیْمٌ بِبَیْتٍ فِیْ رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَاِنْ كَانَ مُحِقًّا)) (۴۰)

"میں جنت کے اطراف میں گھر کا ضامن ہوں اس شخص کے لئے جو حق پر ہونے کے باوجود بحث مباحثہ سے اجتناب کرے"۔

اور کسی مسلمان کو خوف زدہ کرنے سے منع فرمایا :

لاَ یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّرُوْعَ مُسْلِمًا (۴۱)

یہ وہ اصولی تعلیمات ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی اُمت کے نازک آبگینہ کی حفاظت کے لئے عطا فرمائی تھیں۔ آج کے مسلمانوں کو ان تعلیمات پر عمل کرنے کی اشد ضرورت ہے ' تاکہ مسلمانوں کے آپس کے تعلقات درست ہوں اور امن و بھائی چارہ قائم ہو۔

۶ عدمِ برداشت کا نتیجہ ' مسلمانوں کا آپس میں جنگ و جدال :

سطور بالا سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ حضور ﷺ کی تعلیمات افراط و تفریط سے پاک راہِ معتدل کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور بنی نوع انسان کو پُرامن بقائے باہمی (Peaceful Mutual Co-existence) کے اصول کے ذریعے ایک کنبہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہیں ' لیکن بدقسمتی سے آج مسلمان ان تعلیمات پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے آپس میں ہی دست و گریبان ہیں۔ وہ اُمت جو ہر لحاظ سے ناقابل تقسیم وحدت تھی اور اسے بنیانِ مرصوص بن کر زمانے میں اسلام کے پیغام کو پوری انسانیت تک پہنچانا تھا ' آج وہ خود افتراق و تشتّت کا شکار ہے۔ مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اور گروہ مسلکوں کی بنیاد پر ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں اور چھوٹے چھوٹے فروعی اور نقطۂ نظر کے

اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ غیر مسلموں والا سلوک شروع کر دیا ہے جو کہ انتہائی خطرناک ہے۔ کسی بھی معاملے میں اختلافِ رائے کا ہونا کوئی مذموم چیز نہیں' کیونکہ قدرت کے نظام میں سو فیصد یکسانیت (Monotony) محال ہے' لیکن اختلاف رائے کو اتنا بڑھالینا کہ بات باہمی نزاع اور جنگ و جدال تک پہنچ جائے' یہ بہرحال مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔ غیر منصوص احکام میں اختلاف رائے خود رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں آپ ﷺ کی مجلس میں بھی ہوتا رہا اور خلفائے راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں جب نئے نئے مسائل سامنے آئے جن کا ذکر قرآن و احادیث میں صراحتاً نہ تھا تو اختلاف رائے ہوا اور یہ اختلاف رائے عقل و دیانت کی بنا پر ناگزیر [۴۲] تھا' لیکن بات کبھی مستقل جھگڑے اور ایک دوسرے کی تفسیق و تکفیر تک نہیں پہنچی' جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ ایک دفعہ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک مسئلہ میں اختلاف رائے ہو رہا تھا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو غضب ناک ہو کر باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ "افسوس' رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں دو ایسے شخص جھگڑ رہے ہیں جن کی طرف لوگوں کی نظریں ہیں اور جن سے لوگ دین کا استفادہ کرتے ہیں۔" پھر دونوں حضرات کے اختلاف کا فیصلہ یوں کیا "صَدَقَ اُبَیٌ فَلَمْ یَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ" یعنی صحیح بات تو اُبی بن کعب کی ہے مگر اجتہاد میں کوتاہی ابن مسعود نے بھی نہیں کی۔ [۴۳] حضرت عمر فاروقؓ کے اس فیصلے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اجتہادی مسائل و اختلافات میں ایک قول صحیح و صواب ہوتا ہے اور دوسرا اگرچہ صواب نہیں ہوتا مگر ملامت اس پر بھی نہیں کی جاسکتی' کیونکہ بخاری و مسلم میں عمرو بن العاصؓ سے ایک روایت ہے کہ جب کوئی اجتہاد کرے اور وہ حکم ٹھیک ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں' اور جب اجتہاد میں غلطی ہو تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔ [۴۴] دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایسے اجتہادی مسائل میں اختلاف پر زور دینا اہل علم کے لئے مناسب نہیں جس سے ایک دوسرے پر ملامت یا نزاع و جدال کے خطرات پیدا ہوں۔

امام شافعیؒ کا قول ہے کہ مجتہدین کو آپس میں ایک دوسرے کا تخطیہ نہیں کرنا چاہئے' یعنی ان میں ایک دوسرے کو یوں نہ کہے کہ آپ غلطی پر ہیں۔ [۴۵] کیونکہ

مجتہدین کے اختلافات میں جب کوئی جانب منکر نہیں ہوتی تو غیر منکر پر نکیر خود منکر ہے' اس لئے نرمی و خیر خواہی سے انسان دوسرے کو متنبہ کر دے' اگر وہ قبول کر لے تو بہتر ہے ورنہ جھگڑا اور بدگوئی نہ کرے۔ امام مالکؒ کا قول ہے کہ علم میں جھگڑا اور جدال نورِ علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ ایک شخص جس کو سنّت کا علم ہے' کیا وہ حفاظت سنّت میں جدال کر سکتا ہے؟ فرمایا نہیں' بلکہ اس کو چاہئے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کر دے' وہ قبول کر لے تو بہتر ہے ورنہ سکوت اختیار کرے۔ (۴۶) (نزاع و جدال سے پرہیز کرے) قرآن میں ﴿ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ کا یہی مطلب ہے کہ حجت و دلیل کے ساتھ افہام و تفہیم کی کوشش کی جائے۔ (۴۷)

اور بقول مولانا مفتی محمد شفیعؒ اجتہادی و فروعی اختلافات کے ساتھ جو معاملہ آج کل کیا جا رہا ہے کہ اسی بحث و مباحثہ کو دین کی بنیاد بنالی گئی ہے اور اس پر باہمی جنگ و جدال اور سب و شتم تک نوبت پہنچا دی گئی ہے' یہ طرزِ عمل بلاشبہ قرآن حکیم کے حکم: "وَلَا تَفَرَّقُوْا" کی کھلی مخالفت اور صحابہؓ و تابعینؒ کی سنّت کے بالکل خلاف ہے۔ اسلافِ اُمت میں کبھی کہیں نہیں سنا گیا کہ اجتہادی اختلافات کی بناء پر اپنے سے مختلف نظریہ رکھنے والوں پر اس طرح نکیر کیا گیا ہو (۴۸) (جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔)

آج حضور ﷺ کے علم کے وارثوں کو آپؐ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے آپس میں رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے افہام و تفہیم پیدا کرنا ہوگی' (بمطابق ﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ﴾ اور بزرگوں کے اس قول پر عمل کرنا ہوگا کہ "اپنے مسلک کو چھوڑو نہ اور دوسرے کے مسلک کو چھیڑو نہ۔ (۴۹)" کیونکہ تمام اُمّت کا اس پر اتفاق ہے اور عقلاً بھی اس کے سوا کوئی صورت دین پر عمل کرنے کی نہیں کہ جو لوگ خود اجتہاد کا درجہ نہیں رکھتے وہ اجتہادی مسائل میں کسی امام یا مجتہد کی رائے پر عمل کریں اور اسی طرح دوسرے کسی دوسرے امام مجتہد کی پیروی کریں تو کوئی حرج نہیں' جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "انہیں حضور ﷺ نے فقہ کے مذاہب اربعہ کو یکساں تصور کرنے کی ہدایت کی' کیونکہ فقہ کے تمام قوانین کی اصل بنیاد تو عنایت الٰہی ہے' اس کے بعد جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا اس کے مطابق اس اصل سے نئی نئی شاخیں اور

الگ الگ صورتیں بنتی جاتی ہیں۔ چونکہ رسول اللہؐ کی روح کے جوہر میں ان تمام فقہی فروعات کا بنیادی علم موجود ہے' اسلئے آپؐ کی نظر میں ان میں سے ایک کو دوسرے پر کوئی امتیاز نہ ہو"۔ آگے وہ لکھتے ہیں "بات دراصل یہ ہے کہ فقہ کے مذاہب گو ایک دوسرے سے مختلف ہیں' لیکن جہاں تک فقہ کے ضمن میں دین اسلام کے ضروری اصول ومبادی کا تعلق ہے وہ مذاہب فقہ میں سے ہر مذہب میں موجود ہیں"۔ (۵۰)

اس لئے آج علماء کرام کو فقہی وفروعی مسائل میں توسع اور وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے ایک دوسرے کو برداشت کرنا ہوگا اور اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے اُمت کے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرنا ہوگی۔ اور اگر تنقید ضروری ہی ہو تو پھر قرآنی حکم ﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ (۵۱) کے مطابق مخالف کے معاملے میں عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا ہوگا۔ اور دوسروں پر تنقید کرتے وقت یہ بات مستحضر رہے کہ ربّ العالمین کی عدالت میں ہر بات اور دعوے کو ثابت کرنا پڑے گا۔ (کوئی ایسا دعویٰ جزم کے ساتھ نہ کیا جائے جسے شرعی اصولوں کے مطابق وہاں ثابت نہ کیا جاسکے) (۵۲)

① باہمی تکفیر کا مسئلہ

مسلمانوں کے درمیان افتراق و انتشار کا بڑا سبب تکفیر کا فتنہ ہے' یعنی ایک فرقے یا مسلک کا دوسرے کو برداشت نہ کرتے ہوئے اس کے متبعین کو کافر قرار دے کر خارج از اسلام سمجھنا (۵۳)۔ باہمی تکفیر کا یہ فتنہ اتنا وبائی ہے کہ جس کی زد سے آج کوئی مسلمان محفوظ نہیں' کیونکہ ہر مسلمان کا کسی مسلک یا جماعت سے تعلق ہے جو دوسرے کے نزدیک نہ صرف یہ کہ کافر بلکہ مباح الدم اور واجب القتل ہے۔ بعض مفتیوں کے ایسے فتوے بھی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ جو شخص فلاں فرقے اور اس کے فلاں فلاں اشخاص کو کافر نہ سمجھے وہ کافر ہے۔ ایسے ہی فتوؤں اور مناظروں کی وجہ سے اُمت مسلمہ اس وقت متحارب گروپوں میں تقسیم ہے اور اس مسئلہ کی وجہ سے اُمت کو جتنا نقصان پہنچا اور عالمی سطح پر مسلمانوں کی جتنی بدنامی ہوئی اتنی کسی اور مسئلہ کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ بلکہ اس وجہ

سے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی علماء اور اسلام سے بُعد کی کیفیت پیدا ہوئی ہے ـــــ یہی وہ فتنہ ہے جس کی وجہ سے آج اُمت کی پناہ گاہیں (عبادت گاہیں) بھی محفوظ نہیں اور انہیں مسلمانوں کے معصوم خون کے ساتھ رنگین کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن و حدیث سے جو ہدایات ملتی ہیں ان کے مطابق جو شخص ضروریاتِ دین کا انکار نہ کرتا ہو اور قبلہ کی طرف نماز پڑھتا ہو' وہ جتنا بھی گناہ گار اور کبائر کا مرتکب ہو اس کی تکفیر کسی طرح بھی جائز نہیں۔ مسلمان بڑی سے بڑی ناگوار بات بلکہ گالی تک برداشت کرلیتا ہے لیکن جب اسے کافر کہا جائے تو وہ یہ کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اس فتنہ کے سدباب کے لئے بڑی واضح تعلیمات عطا کی ہیں۔

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((ثَلَاثٌ مِنْ اَصْلِ الْاِیْمَانِ : اَلْکَفُّ عَمَّنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ' لَا تُکَفِّرْهُ بِذَنْبٍ وَلَا تُخْرِجْهُ مِنَ الْاِسْلَامِ بِعَمَلٍ . . .)) (۵۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"تین چیزیں اصل ایمان ہیں (ان کا ایمان سے بنیادی تعلق ہے) ایک یہ کہ جو شخص کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھتا ہو اس کے متعلق زبان کو روک رکھنا' نہ کسی گناہ کی وجہ سے اس کی تکفیر کی جائے اور نہ کسی برے عمل کی وجہ سے اسے اسلام سے خارج کیا جائے . . ."

جو شخص کسی کو کافر کہے درانحالیکہ وہ حقیقت میں کافر نہ ہو تو کفر کا فتویٰ تکفیر کرنے والے کی طرف لوٹ آئے گا :

((اَیُّمَا رَجُلٍ قَالَ لِاَخِیْهِ یَا کَافِرُ فَقَدْ بَاءَ بِهَا اَحَدُهُمَا)) (۵۵)

"جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کو کافر کہے تو یہ قول دونوں میں سے کسی ایک پر ضرور پڑے گا"۔

((لَا یَرْمِی رَجُلٌ رَجُلاً بِالْفُسُوْقِ وَلَا یَرْمِیْهِ بِالْکُفْرِ اِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَیْهِ اِنْ لَّمْ یَکُنْ صَاحِبُهُ کَذٰلِكَ)) (۵۶)

"جب کبھی ایک شخص دوسرے پر فسق یا کفر کی تہمت لگاتا ہے تو وہ تہمت اس پر

لوٹ آئے گی اگر وہ شخص جس پر تہمت لگائی گئی تھی درحقیقت کافر یا فاسق نہ ہو"۔

((مَنْ دَعَا رَجُلاً بِالْكُفْرِ اَوْ قَالَ عَدُوَّاللّٰهِ وَلَيْسَ كَذٰلِكَ اِلاَّ حَارَ عَلَيْهِ)) (۵۷)

"جو شخص کسی کو کافر یا دشمن خدا کہے، جبکہ وہ شخص ایسا نہ تھا، تو یہ قول خود قائل پر ضرور پڑے گا"۔

((مَنْ لَعَنَ مُؤْمِنًا فَهُوَ كَقَتْلِهٖ وَمَنْ قَذَفَ مُؤْمِنًا بِالْكُفْرِ فَهُوَ كَقَتْلِهٖ)) (۵۸)

"جس نے کسی مؤمن پر لعنت کی اس نے گویا اسے قتل کیا، اور جس نے کسی مؤمن پر کفر کی تہمت لگائی اس نے گویا اسے قتل کر دیا"۔

اسی طرح فقہاء نے کفر کے حوالے سے یہ اصول بیان کیا ہے :

من قواعد اهل السنة والجماعة ان لا يكفر واحد من اهل القبلة (۵۹)

"اہل سنّت والجماعۃ کے بنیادی قواعد میں سے ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہ کی جائے"۔

اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے :

عن ابی حنيفة لا نكفر اهل القبلة بذنب (۶۰)

اور اہل قبلہ سے کیا مراد ہے؟ اس کا جواب فقہاء نے یہ دیا ہے :

واعلم ان اهل القبلة الذين اتفقوا علٰى ماهو من ضروريات الدين كحدوث العالم وحشر الاجساد (۶۱)

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب جواہر الفقہ میں ضابطہ کفر کے ذیل میں لکھا ہے :

"اگر کسی خاص شخص یا کسی خاص جماعت کے متعلق حکم بالکفر میں تردد ہو، خواہ تردد کے اسباب میں علماء کا اختلاف ہو، خواہ قرائن کا تعارض ہو یا اصول کا غموض تو اسلم یہ ہے کہ نہ کفر کا حکم لگایا جائے نہ اسلام کا حکم۔ اس کی نظیر وہ حکم ہے جو اہل کتاب کی مشتبہ روایات کے متعلق احادیث میں وارد ہے کہ

((لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَقُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا)) یعنی اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب' اور کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو اُس نے اتارا ہم پر"۔ (۶۲)

روایاتِ بالا سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ مسئلہ تکفیر نہایت نازک مسئلہ ہے' اور بقول مولانا مودودی :

"اسلام میں کسی شخص یا گروہ کو کافر کہہ دینے کا معنی یہی نہیں ہے کہ اس کے اعتقاد اور نیت پر حملہ کیا گیا' بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی معاشرے اور اس کے ایک فرد یا چند افراد کے درمیان برادری' محبت' معاشرت اور باہمی تعاون کے جتنے رشتے تھے سب کاٹ دیئے گئے' اُمت مسلمہ کے جسم سے ایک عضو یا متعدد اعضاء کو کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ یہ فعل اگر خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق ہو تو یقیناً حق ہے' اس صورت میں اس سڑے ہوئے عضو کو کاٹ پھینک دینا ہی اسلام کے ساتھ سچی خیر خواہی ہے' لیکن اگر قانونِ الٰہی کی رو سے وہ سڑا ہوا نہ ہو اور محض ظلم سے کاٹ ڈالا ہو تو ظلم خود اس عضو سے بڑھ کر اس جسم پر ہو گا جس سے وہ کاٹا گیا ہو"۔ (۶۳)

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس دینی رشتہ کے احترام کی سخت تاکید کی ہے اور اس شخص کے بارے میں سخت عذاب کی دھمکی دی ہے جو اُمت کے افراد میں فتنہ و انتشار کا باعث بنے۔ (۶۴)

② شیعہ سُنّی تنازع

گزشتہ چودہ سو سال سے شیعہ اُمّتِ مسلمہ میں ایک فرقے کی حیثیت سے موجود ہیں' اور اس کے باوجود کہ ان میں سے بعض غالی گروہوں کی انتہائی گمراہی پر مشتمل عقائد کی وجہ سے مختلف علماء و فقہاء نے ان کی تفسیق و تکفیر بھی کی' لیکن مجموعی اعتبار سے کبھی بھی اُمت کا تمام اہل تشیع کی تکفیر پر اجماع نہیں ہوا (۶۵) (کیونکہ ان میں کئی فرقے اعتدال پسند اور بعض بین بین ہیں) اُمت کی تاریخ میں معمولی نہیں بڑے بڑے اختلاف ہوئے' لیکن ان کی بنیاد پر کسی کی تکفیر نہیں ہوئی۔ جس قدر "tolerance" اسلام کی تاریخ میں رہا اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی' جبکہ عیسائیت کے مختلف فرقوں میں اتنا

کشت و خون ہوا ہے کہ اس پر خود ان کی گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے اختلافات کو "absorb" کیا ہے، کیونکہ مختلف ادوار میں جتنے فرقے پیدا ہوئے وہ چونکہ بنیادی ایمانی عقائد اور ارکان اسلام کو کسی نہ کسی صورت میں مانتے تھے لہٰذا نہ ان کی تکفیر ہوئی اور نہ انہیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا۔ چنانچہ علماء متقدمین نے مختلف فرقوں پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں ان فرقوں (معتزلہ، مرجئہ، قدریہ، روافض اور جہمیہ وغیرہ) کو مسلم قرار دیا اور ان کے عقائد و افکار پر بحث و تحقیق کی۔ البتہ بعض کتابوں میں ان کو فرقہ ضالہ، یعنی گمراہ اور بھٹکے ہوئے فرقوں سے تعبیر کیا۔ (۶۶) شیخ ابو الحسن الاشعریؒ نے اس طرح کی ایک کتاب لکھی، اس کا نام "مقالات الاسلامیین" رکھا جو اس کتاب میں ذکر شدہ فرقوں کے مسلمان ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ (۶۷) اسی طرح مصری عالم شیخ ابو زہرہ نے اس موضوع پر ایک عام فہم کتاب لکھی ہے جس میں ان سب فرقوں کو (ماسوائے ان کی چند شاخوں کے) مسلم تسلیم کرتے ہوئے ان کے عقائد و نظریات کو واضح کیا ہے۔ (اس کا اردو ترجمہ پاکستان کے ایک پروفیسر غلام احمد حریری مرحوم نے کیا ہے۔)

بالفرض اگر کوئی شخص یا گروہ کچھ ایسے غلط عقائد کا قائل تھا اور کہیں تکفیر بھی ہوئی ہے، لیکن موجودہ دور میں جو قتل و غارت اور جنگ و جدال کا بازار گرم ہوا ہے ایسا کبھی کسی دور میں نہیں ہوا اور نہ ہی کسی فرد یا گروہ کو اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ قانون اپنے ہاتھوں میں لے کر دوسرے اشخاص یا گروہ پر مسلح حملے کرے، اور پھر اس سے آگے بڑھ کر ان کے مقاماتِ عبادت پر حملے کئے جائیں اور اسے جہاد اور کارِ ثواب قرار دیا جائے۔ اسلام تو کھلے کافروں کے معابد کو نقصان پہنچانے یا ان پر حملے کرنے کو حرام اور گناہ کبیرہ قرار دیتا ہے۔ (ملاحظہ ہو اس مضمون کا سیکشن نمبر ۸) جبکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے دوسروں کے معابد پر حملے کرتے ہیں اور مسلمانوں کا بے گناہ قتل عام کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسوہ اس حوالے سے تمام گروہوں کے لئے مشعل راہ بن سکتا ہے کہ آپؓ نے اپنے دور کے خوارج کو (جو کہ اعلانیہ طور پر اسلامی حکومت کے خلاف تھے اور بزورِ شمشیر اس کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے اور کئی غلط خیالات و نظریات

کے قائل تھے) یہ پیغام دیا :

كُوْنُوْا حَيْثُ شِئْتُمْ وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لاَ تَسْفِكُوْا دَمًا وَلاَ تَقْطَعُوْا سَبِيْلاً وَلاَ تَظْلِمُوْا اَحَدًا (۶۸)

"تم جہاں چاہو رہو' ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خونریزی اور راہزنی اختیار نہ کرو اور ظلم سے باز رہو"۔

ایک دوسرے موقع پر انہیں یہاں تک پیغام دیا :

لاَ نَبْدَءُكُمْ بِقِتَالٍ مَا لَمْ تُحْدِثُوْا فَسَادًا (۶۹)

"جب تک تم فساد کے مرتکب نہیں ہو گے ہم تمہارے خلاف لڑائی کی ابتداء نہیں کریں گے"۔

آج اُمّتِ مسلمہ کے مختلف گروہوں اور جماعتوں کو تحمل و برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے "Peacefully" ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی ضرورت ہے۔ اور بجائے سختی اور تشدد کے آپس میں افہام و تفہیم پیدا کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے' کیونکہ زبردستی اور شدت سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا' بلکہ مزید اُلجھ جاتا ہے۔ جیسا اہل سُنّت کے ایک بڑے عالم اور شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صاحب صفدر مدّ ظلّہٗ نے مختلف جماعتوں اور گروہوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کے نام اپنے ایک خط میں یہ لکھا :

"نوجوان جذباتی ہوتے ہیں اور جذبات میں بہت کچھ کر اور کہہ جاتے ہیں۔ شدت اور سختی سے کبھی بھی مسائل حل نہیں ہوتے اور نہ قوت و طاقت سے کسی فرد یا نظریہ کو ختم کیا جا سکتا ہے ..... اس لئے گزارش ہے کہ نوجوانوں کو قولاً اور فعلاً شدت اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ روکیں۔ در و دیوار پر کافر کافر لکھنے اور نعرہ بازی سے بجائے فائدہ کے نقصان ہو گا (اور ہوا ہے) عیاں راچہ بیاں"(۷۰)

(جاری ہے)

حواشی و حوالہ جات

(۳۰) یہ پانچ حقوق فقہاء اسلام نے قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں متعین کئے ہیں۔ اصلی عبارت موفقات' شاطبی' ج ۴' ص ۲۲ کی ملاحظہ ہو : مجموع الضروریات

خمسة حفظ الدین والنفس والنسل والمال والعقل" فقہاء نے لکھا ہے اگر ان پانچ حقوق کی رعایت نہیں کی جائے گی تو انفرادی زندگی میں [illegible] گا اور پھر قومی و بین الاقوامی معاملات میں بھی کشیدگی پیدا ہوگی۔ اسلام نے ہر ایسے طریقے کو منع کیا ہے جس کی وجہ سے انسان کے یہ پانچ حقوق معطل ہوں۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: اسلام کے بین الاقوامی اصول و تصورات از مجیب اللہ ندوی، ص ۸۷

(۳۱) العلاقات الدولہ ص ۵۱ بحوالہ اسلام کے بین الاقوامی اصول و تصورات از مجیب اللہ ندوی، ص ۱۴۸

(۳۲) مفہوم قرآنی آیات سورۃ الحج ۳۹، ۴۰

(۳۳) قول شیخ ابو زہرہ، بحوالہ ۳۱

(۳۴) سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۳۴۰ اور الجہاد فی الاسلام۔ مصنفہ مولانا مودودی، ص ۲۲۴ تا ۲۳۴

(۳۵) قاضی سلمان منصور پوری۔ اسوۂ حسنہ۔ مسلم پبلیکیشنز، اردو بازار، لاہور، ص ۶۷

(۳۶) ایضاً۔ اور انعام یافتہ مضامین۔ وزارت مذہبی امور، اسلام آباد، ص ۳۶

(۳۷) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب لا یخطب علی خطبة اخیه حتی ینکح او یدع۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظن والتجسس والتنافس

(۳۸) اس سیکشن کے لئے زیادہ استفادہ سیرت النبیؐ، ج ۶ ص ۱۵۴ تا ۱۶۰ سے کیا ہے۔

(۳۹) صحیح البخاری، کتاب المظالم، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم

(۴۰) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی حسن الخلق

(۴۱) ابوداؤد، کتاب الادب۔ بحوالہ دائرۂ معارف اسلامیہ۔ ج ۲۱، ذیل عنوان "مسلم"

(۴۲) ماہنامہ تدریس القرآن (اگست ۹۸ء) میں علامہ ابن قیم کی کتاب اعلام الموقعین کے حوالہ سے یہ بات لکھی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے درمیان ۱۰۰ مسائل میں اختلاف تھا۔ اسی طرح اور صحابہ کے درمیان میں رایوں کے اختلاف کا ذکر ہے..... کسی نے بھی اختلاف کو برا نہیں مانا۔ تمام لوگوں نے اس کو ایک فطری معاملہ سمجھا جس سے نہ باہمی محبت ختم ہوئی اور نہ مسلمانوں کی جماعت میں کوئی انتشار پیدا ہوا۔ ص ۵ زیر نگرانی جمعیت تعلیم القرآن (ٹرسٹ) عالمگیر روڈ، کراچی۔

(۴۳) جامع العلم، ج ۲، ص ۸۴۔ بحوالہ وحدت امت۔ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور ۱۹۸۵ء، ص ۷

(۴۴) مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ۔ معارف القرآن۔ ج ۲، ص ۱۴۳

(۴۵) ملاحظہ ہو حوالہ نمبر ۴۳

(۴۶) اوجز المسالک۔ بحوالہ وحدت امت، ص ۱۷

(۴۷) مولانا سرفراز خان صاحب صفدر، تبلیغ اسلام۔ مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ ۱۹۹۴ء، ص ۴۹

(۴۸) مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ۔ معارف القرآن ج ۲، ص ۱۴۴

(۴۹) یہ قول مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو کہ دراساتِ اسلامیہ (قاضی مجیب الرحمٰن) سے لیا گیا ہے۔

(۵۰) قاضی جاوید، افکار شاہ ولی اللہ، ص ۱۷۳ اور ارمغان شاہ ولی اللہ۔ مرتب محمد سرور، ص ۱۷۸۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ روڈ، لاہور۔

(۵۱) المائدہ ۵ : ۸

(۵۲) دوسروں پر تنقید کے حوالہ سے احتیاط و تثبت کے لئے ملاحظہ ہو جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی کتاب "میرے والد میرے شیخ اور ان کا مزاح و مذاق کے صفحات نمبر ۱۱۳۔ ۱۳۴ ادارۃ المعارف، کراچی نمبر ۱۴۔

(۵۳) باہمی تکفیر کے سلسلے میں مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا محمد طاسین رحمۃ اللہ علیہ کا کتابچہ "مسئلہ ایمان و کفر قرآن و حدیث کی روشنی میں" تنظیم اسلامی پاکستان، ۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو۔ لاہور ۱۹۹۷ء۔

(۵۴) سنن ابی داؤد، ج اول، ص ۳۴۳۔ بحوالہ بالا، ص ۷

(۵۵) صحیح بخاری۔ بحوالہ تفہیمات، حصہ دوم۔ مولانا مودودی۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۸۱ء، ص ۱۸۱

(۵۶) ایضاً

(۵۷) صحیح مسلم بحوالہ مذکورہ

(۵۸) صحیح بخاری بحوالہ مذکورہ

(۵۹) شرح عقائد نسفیہ۔ بحوالہ جواہر الفقہ، مفتی محمد شفیع صاحب۔ ادارۃ المعارف، کراچی نمبر ۱۴، ج ۱، ص ۳۰

(۶۰) جواہر الفقہ، ج ۱، ص ۳۱

(۶۱) ایضاً، ص ۳۳

(۶۲) ایضاً' ص ۶۳

(۶۳) مولانا مودودی' تفہیمات' حصہ دوم' ص ۱۸۱'۱۸۲

(۶۴) امّتِ مسلمہ میں فتنہ و انتشار پھیلانے پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے عذاب کی وعیدوں کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب "امّتِ مسلمہ کے لئے سہ نکاتی لائحہ عمل" میں طبع شدہ تقریر حضرت مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ (حضرت جی) بن مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور۔

(۶۵) اہلِ تشیع کے بارے میں شیخ ابو زہرہ اپنی کتاب اسلامی مذاہب کے ص ۳۷'۴۷ پر لکھتے ہیں کہ ان کے بعض فرقوں میں حد درجہ کا غلو پایا جاتا تھا' جیسے غرابیہ' سبیئہ' کیانیہ اور ان کے اشباہ و امثال۔ شیخ ابو زہرہ آگے لکھتے ہیں : ان غالی فرقوں کے بارے میں موجودہ شیعہ بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ اہلِ قبلہ میں بھی شمار کئے جانے کے قابل نہیں چہ جائیکہ ان کو شیعہ تصور کیا جائے۔ شیخ کہتے ہیں اس لئے ہمیں ان کے اس دعوے کی تائید کرنا چاہئے۔ اسی طرح مدرسہ نصرۃ العلوم' گوجرانوالہ کے بانی مولانا صوفی عبدالمجید صاحب کا ذوق بھی یہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں : "اس ملک میں بریلوی' دیوبندی' اہل حدیث اور شیعہ سبھی رہتے ہیں اور یہ بات ذہن سے نکال دیں کہ ان میں سے کوئی کافر ہے' ہرگز نہیں' بلکہ مسلمان ہوتے ہوئے بعض میں گمراہی پائی جاتی ہے اور بعض غلط چیزیں پائی جاتی ہیں' مگر ہیں تو سب مسلمانوں ہی کے مختلف فرقے۔ ان سب کو اس ملک میں رہنے کا حق حاصل ہے۔ سب کا فرض ہے کہ وہ انصاف اور اعتدال کے ساتھ رہیں —— ایک مسلک کے لوگوں کا دوسرے مسلک کے لوگوں کے خلاف مشتعل کرنا تو بدترین قسم کی غنڈہ گردی ہے"۔ خطبات سواتی' مکتبہ دروس القرآن' فاروق گنج' گوجرانوالہ ۱۹۹۵ء' ص ۲۶۵'۲۶۶۔

ہم نے گزشتہ سال سے اس مسئلہ پر کافی تحقیق کی ہے اور مختلف علماء وقت سے رجوع کیا' جن میں مولانا جسٹس تقی عثمانی اور مولانا مفتی محمد جمال صاحب وغیرہ سرفہرست ہیں۔ جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی کا بھی نقطہ نظر یہی ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ صاحب کا بھی یہی ذوق تھا کہ "جو شخص (شیعہ یا کوئی اور) بنیادی ضروریاتِ دین کا انکار نہ کرتا ہو تو اس کی تکفیر نہ کی جائے..... کیونکہ کسی کو کافر قرار دینا چونکہ نہایت سنگین معاملہ ہے اس لئے اس میں بے حد احتیاط ضروری ہے۔ اگر بالفرض کوئی تقیہ بھی کرے تو وہ اپنے باطنی غلط عقائد کی وجہ سے عنداللہ کافر ہوگا' لیکن فتویٰ اس کے ظاہری اقوال پر ہی دیا جائے گا۔ اس لئے گزشتہ چودہ سو سال میں علمائے اہل سنت کی اکثریت نے شیعوں کو علی الاطلاق کافر نہیں

کہا۔ ہاں، جو شخص ضروریاتِ دین کا انکار کرتا ہو وہ بلاشبہ کافر ہے (واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم)"۔ (رجسٹر فتاویٰ جامعہ دارالعلوم کراچی، ص ۵۳)

(۶۶) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا محمد طاسین صاحب کا کتابچہ "مسئلہ ایمان و کفر، قرآن و حدیث کی روشنی میں" ص ۱۳

(۶۷) اصل عبارت ملاحظہ ہو: اختلف الناس بعد نبیهم فی اشیاء کثیرة وضلل فیها بعضهم بعضا وبری بعضهم بعضا فساروا فرقا متباینین واحذابا متشتتین الا الاسلام یجمعهم ویشتمل علیهم۔ یعنی لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے بعد بہت سی باتوں میں اختلاف کیا، بعض نے بعض کو گمراہ قرار دیا، اور بعض نے بعض کو بری گردانا۔ پس اس طرح وہ باہم مختلف گروہ اور جدا جدا جماعتیں بن گئے۔ مگر یہ کہ اسلام ان سب کو جمع کرتا ہے اور ان سب کو دائرہ اسلام میں شامل کرتا ہے۔ مقالات الاسلامیین، ص ۲

(۶۸) نیل الاوطار، ج ۷، ص ۴۹ بحوالہ اسلام اور جدید دور کے مسائل۔ مولانا محمد تقی امینی، قدیمی کتب خانہ مقابل آرام، کراچی، ص ۲۹۶

(۶۹) ایضاً، ص ۲۹۷

(۷۰) مولانا سرفراز خان صفدر، مکتوب گرامی شائع کردہ مدرسہ فیضان سرفراز۔ پل نوشہرہ، سانسی، جناح روڈ، گوجرانوالہ ۱۹۹۲ء، ص ۳، ۴

بقیہ : سیرت وسوانح

میں اور شہاب الدین بوصیری نے "اطراف المسانید العشرہ" میں اس کے مرویات نقل کئے ہیں۔

مسند ابو یعلیٰ مولانا ارشاد الحق اثری کی تحقیق، تعلیق اور تخریج سے ۶ جلدوں میں ۱۹۸۸ء میں دار القبلة للثقافة الاسلامیة، جدہ سعودی عرب سے شائع ہو چکی ہے۔

مراجع و مصادر

۱) ذہبی، تذکرة الحفاظ
۲) ابن عماد، شذرات الذہب
۳) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ
۴) شاہ عبدالعزیز، بستان المحدثین
۵) عبدالرحمٰن مبارک پوری، مقدمہ تحفة الاحوذی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاح مبارک

مرتب : حافظ محبوب احمد خان

بہت سے کاموں میں ہمارے غلط عمل سے ہمارے نظریات بدل چکے ہیں' تخیل کہاں سے کہاں چلا گیا ہے' ہر معاملہ میں اعتدال کھو بیٹھے ہیں۔ اگر ہم سنجیدہ اور متین بنتے ہیں تو اس قدر کہ تہذیب ہم سے کوسوں دور رہتی ہے اور اگر مزاح کرتے ہیں تو اس میں اعتدال کی روش ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں اور موجودہ دور میں مزاح کا مطلب ہی شخصیات پر الزام تراشی اور کسی کی شخصیت کو داغدار کرنا سمجھ لیا گیا ہے۔ جبکہ حقیقتاً مزاح کیا ہے؟ مزاح کا لفظ مَزَحَ یَمْزَحُ مَزْحًا وَ مِزَاحًا سے ہے جس کا معنی ہنسی' مذاق' دل لگی' خوش طبعی وغیرہ ہے۔ تاج العروس میں اس کے اصطلاحی معنی یہ ہیں :

اَنَّهُ الْمُبَاسِطَةُ اِلَى الْغَيْرِ عَلٰى جِهَةِ التَّلَطُّفِ وَالْاِسْتِعْطَافِ دُوْنَ اَذِيَّةٍ حَتّٰى يَخْرُجَ الْاِسْتِهْزَاءُ وَالسُّخْرِيَّةُ

اس عبارت میں خیر اور تلطف... اور اذیت سے خالی ہونے کے پہلو قابل توجہ ہیں۔

پھر لکھا ہے :

قال الائمة : الاكثار منه والخروج من الحد مُخِلٌّ بالمروءة والوَقار [1]

اس عبارت سے یہ اصول برآمد ہوا کہ مزاح کو شائستگی اور وقار کا پہلو نظرانداز نہ کرنا چاہئے اور یہ بھی کہ اس کا مقصد مباسطۃ (کشادگی طبع)' خوش خلقی اور فرحت قلوب ہے نہ کہ اذیت پہنچانا' یا کسی کی تحقیر و تذلیل کرنا۔

اس کی کئی صورتیں ہیں۔ مزاح کی یہ صورتیں مختلف افراد اور نسلی اقوام کی معاشرت اور کلچر کی بنا پر مختلف ہوتی ہیں' جن میں سے بعض خوشگوار اور بعض ناخوشگوار

اور غیر معتدل بھی ہوتی ہیں۔

کبھی کبھی مزاح کے ساتھ لفظ ظرافت بھی استعمال ہوتا ہے۔ ابن منظور نے لسان العرب میں ظرفة (وَالظرف) کے معنی بلاغت' حلاوت' جمال' ملاحت کئے ہیں۔ وَفی الوَجْه الحُسْنُ وفی القلب الزَّکاة مطلب یہ کہ ظرافت کا تعلق قلب و دماغ سے بھی ہے۔ اور ظاہری شکل و صورت سے بھی' لیکن جہاں تک بیان و بلاغت کا تعلق ہے حقیقی ظرافت نگار کنایہ و تعریض سے کام لیتا ہے۔ لہٰذا ظرافت کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ کلام پر عبور حاصل ہو اور کنایہ و تعریض کا استعمال کیا جائے لیکن اس میں جھوٹ کی آمیزش نہ ہو۔ یہ ہیں مزاح و ظرافت کی اصولی حدیں' لیکن فن بیان و بلاغت کی کتابوں اور اس کی عملی شکلوں میں ہمیں بہت سے تنوعات ملتے ہیں۔

علی بن ربّن الطبری نے فردوس الحکمت میں ہنسی کا' جو عموماً مزاح کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے' تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "جب انسان کسی اچانک بات کو دیکھ کر یا سن کر چونک پڑے اور اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھانے کے لئے مستعد ہو جائے' لیکن دوسرے ہی لمحے اسے محسوس ہو کہ اس عملی قدم کی ضرورت باقی نہیں رہی تو اس کے خون میں جو ابال پیدا ہو گیا تھا وہ (یکایک فالتو ہو کر) ہنسی کی صورت میں چھلک جاتا ہے"۔ (۲)

علی بن ربّن الطبری کی وفات کے سینکڑوں برس بعد اس بات کو کانٹ (Kant) نے یوں بیان کیا کہ:

> "ہنسی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی شے ہوتے ہوتے رہ جائے اور انسانی توقعات ایک بلبلے کی طرح پھٹ کر ختم ہو جائیں"۔ (۳)

ہنسی ایک حیاتیاتی فعل ہے' جو فاضل جذبے کے اخراج کی صورت میں سامنے آتا ہے' مگر تبسم زیر لب ایک رومانی کیفیت ہے' جو جذبے کے ابھار اور اخراج کے عین درمیان محض ایک موہوم سی کروٹ کی حیثیت رکھتی ہے' اسے جذبے کے لطیف پرتو کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ عربوں' ایرانیوں' ترکوں اور ہندوستانیوں کے ہاں جب ہنسی کو تحریک ملی تو ان میں سے ہر قوم کے مخصوص علاقائی اور ثقافتی پس منظر نے اس ہنسی کو بھی

ایک خاص رنگ عطا کر دیا' مگر جب یہ قومیں اسلامی تہذیب کے سایہ میں آئیں تو اسلام کی رواداری' قوتِ برداشت' ثقافت اور کشادہ نظری کے باعث ان اقوام میں ایک معنی خیز دزدیدہ نگاہی کا جذبہ ابھرا جو اپنے اظہار کے لئے خندۂ دندان نما کا نہیں بلکہ ایک تبسم زیر لب کا طالب تھا۔ فلسفے کی سطح پر یہ خاص رویہ تصوف میں' شاعری کی سطح پر غزل میں اور مزاح کی سطح پر نکتہ آفرینی کے میلان میں ظاہر ہوا۔

اسلام' زندگی اور اس کے مظاہر کی نفی کا قائل نہیں' مگر وہ اس بات پر یقیناً زور دیتا ہے کہ موجود کو عبور کر کے ذات لامحدود کے روبرو سجدہ ریز ہوا جائے۔ دوسری طرف کھلی ہنسی کا جذبہ اس بات کا متقاضی ہے کہ زندگی میں بھرپور شرکت کی جائے۔ چنانچہ اسی لئے اسلامی تہذیب نے ہنسی کی بلند آہنگ یا بے محابا متشدد صورتوں کو وقار نفس کے خلاف سمجھا ہے' مگر باوقار ہنسی اور شرافت آمیز تبسم کو ایک فطری عادت انسانی خیال کیا ہے۔ حافظ' خیام' رومی اور غالب کے ہاں جذبے کی تہذیب کا یہ عمل ایک ایسے لطیف تبسم کی صورت میں ابھرا ہے جس میں ایک خود آشنا ضبط بھی ہے اور مریضانہ خواب بینی کے عمل کا پردہ چاک کرنے کی روش بھی۔ چنانچہ اس تبسم کو اسلامی تہذیب کی روح کا عکاس قرار دینا کچھ ایسا غلط نہیں۔ اگر ہم اس حوالے سے نبی کریم ﷺ کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں مزاح کا ایک زریں اصول بھی حاصل ہو گا۔ آپؐ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ مزاح فرماتے تھے لیکن ھو یمزح و لا یقول الا حقاً گویا مزاح میں حقیقت و صداقت سے انحراف نہ کرنا بھی ایک اہم اصول ہے۔ بہت سی کتب حدیث میں محدثین نے مزاح پر مستقل ابواب باندھے ہیں اور ان ابواب میں وہ واقعات درج کئے ہیں جن سے مذکورہ بالا اصول کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ یہ حدیث کہ :

اَنَّ رَجُلًا اسْتَحْمَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ' فَقَالَ : ((اِنِّیْ حَامِلُكَ عَلٰی وَلَدِ نَاقَةٍ)) فَقَالَ : یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا اَصْنَعُ بِوَلَدِ النَّاقَةِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ((وَهَلْ تَلِدُ الْاِبِلَ اِلَّا النُّوْقُ))

"کسی شخص نے حضور اقدس ﷺ سے درخواست کی کہ کوئی سواری کا جانور

مجھے عطا فرما دیا جائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا : ایک اونٹنی کا بچہ تم کو دیں گے۔ سائل نے عرض کیا کہ حضور میں بچہ کو کیا کروں گا؟ (مجھے تو سواری کیلئے چاہئے) حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر اونٹ کسی اونٹ کا بچہ ہی تو ہوتا ہے"۔ (۴)

یا آپ ﷺ کا حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی سے یہ فرمانا :

((يَا اَبَا عُمَيرٍ مَا فَعَلَ نُغَيْر)) (ترمذی)

"اے ابو عمیر! وہ نغیر (۵) کہاں جاتی رہی؟"

رسول اللہ ﷺ کے اس اسلوب کے حوالے عربی ادب کی کتابوں میں، خصوصاً علامہ ابن جاحظ کی تصانیف میں، کافی ملتے ہیں۔ اس ضمن میں آنحضرت ﷺ کے مزاح کے چند واقعات کا مطالعہ کر لیا جائے تو ہم مزاح کا صحیح تخیل قائم کر سکتے ہیں اور ان میں حضور نبی کریم ﷺ کے مزاحی اسلوب کے چند پہلو اور حکمتیں نمایاں ہوتی ہیں :

① حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ :

انَّ رَجُلاً مِنْ اَهْلِ الْبَادِيَةِ كَانَ اسْمُهُ زَاهِرًا وَّكَانَ يُهْدِى اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَدِيَّةً مِّنَ الْبَادِيَةِ فَيُجَهِّزُهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَّخْرُجَ ' فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((اِنَّ زَاهِرًا بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُوْهُ)) وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِبُّهُ وَكَانَ رَجُلاً دَمِيْمًا ' فَاَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا وَهُوَ يَبِيْعُ مَتَاعَهُ وَاحْتَضَنَهُ مِنْ خَلْفِهِ وَلاَ يُبْصِرُهُ ' فَقَالَ : مَنْ هٰذَا؟ اَرْسِلْنِىْ ' فَالْتَفَتَ فَعَرَفَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ لاَ يَاْلُوْا مَا اَلْصَقَ ظَهْرَهُ بِصَدْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ عَرَفَهُ ' فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ : ((مَنْ يَّشْتَرِىْ هٰذَا الْعَبْدَ؟)) فَقَالَ الرَّجُلُ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذًا وَاللّٰهِ تَجِدُنِىْ كَاسِدًا ' فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((لٰكِنَّ عِنْدَ اللّٰهِ لَسْتَ بِكَاسِدٍ)) اَوْقَالَ : ((اَنْتَ عِنْدَ اللّٰهِ غَالٍ))

"ایک شخص جنگل کے رہنے والے جن کا نام زاہرؓ (بن حرام) تھا وہ جب حاضر

خدمت ہوتے تو جنگل کے ہدایہ سبزی ترکاری وغیرہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے اور وہ جب مدینہ منورہ سے واپس جانے کا ارادہ کرتے تھے تو حضور اقدس ﷺ شہری سامانِ خورد و نوش ان کو عطا فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ زاہر ہمارا جنگل ہے اور ہم اس کے شہر ہیں۔ حضور اقدس ﷺ کو ان سے خصوصی تعلق تھا۔ زاہر کچھ بدشکل بھی تھے، ایک مرتبہ کسی جگہ کھڑے ہوئے وہ اپنا کوئی سامان فروخت کر رہے تھے کہ حضور اقدس ﷺ تشریف لائے اور پیچھے سے ان کی کولی ایسی بھری کہ وہ حضور ﷺ کو دیکھ نہ سکیں، انہوں نے کہا ارے کون ہے مجھے چھوڑ دے۔ لیکن جب کن انکھیوں سے دیکھ کر حضور اکرم ﷺ کو پہچان لیا تو اپنی کمر کو بہت اہتمام سے پیچھے کو کر کے حضور ﷺ کے سینہ مبارک سے ملنے لگے کہ (جتنی دیر بھی تلبس رہے ہزار نعمتوں اور لذتوں سے بڑھ کر ہے) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کون شخص ہے جو اس غلام کو خریدے؟ زاہر نے عرض کیا حضور (ﷺ) اگر آپ مجھے فروخت فرمادیں گے تو کھوٹا اور کم قیمت پائیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، اللہ کے نزدیک تو تم کھوٹے نہیں ہو، یا یہ فرمایا کہ بیش قیمت ہو"۔

حضورِ اقدس ﷺ کا پیچھے سے تشریف لا کر کولی بھر لینا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لینا تو مزاح تھا ہی، یہ ارشاد بھی مزاح ہی تھا کہ اس غلام کا کوئی خریدار ہے؟ اس لئے کہ حضرت زاہر رضی اللہ عنہ غلام نہ تھے آزاد تھے۔ مگر حضور ﷺ کا یہ ارشاد بطور فرض اور تشبیہہ کے تھا۔ یہ حدیث بظاہر تو مزاح ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے اس میں بڑی حکمتیں اور اسرار ہیں۔ اس لئے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے ان کو اپنے سامان کی فروختگی میں نہایت مشغول پایا تو حضور انور ﷺ کو اس میں انہماک اور ان کی توجہ الی اللہ کی کمی کا بظاہر خوف ہوا۔ اس لئے اول کولی بھری کہ حضور ﷺ کے ساتھ تلبس رجوع الی اللہ کا ذریعہ ظاہر ہے اور پھر تنبیہہ کے طور پر ارشاد فرمایا کہ اس غلام کا کوئی خریدار ہے؟ اس لئے کہ جو شخص غیر اللہ میں اس قدر مشغول ہو وہ گویا اپنی خواہشات کا بندہ ہے، لیکن حضور ﷺ کے ساتھ اس تلبس سے انابت الی اللہ یعنی اللہ کی طرف توجہ تام حاصل ہو چکی تھی۔ اس لئے حضور ﷺ نے پھر ان کو مژدہ سنایا کہ اللہ کے نزدیک تو تم کم قیمت نہیں ہو،

بلکہ بیش قیمت ہو۔

② حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے :

اَتَتْ عَجُوْزٌ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ : یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ادْعُ اللّٰہَ اَنْ یُّدْخِلَنِی الْجَنَّۃَ' فَقَالَ : ((یَا اُمَّ فُلَانٍ اِنَّ الْجَنَّۃَ لَا یَدْخُلُھَا عَجُوْزٌ)) قَالَ فَوَلَّتْ تَبْکِیْ' فَقَالَ ((اَخْبِرُوْھَا اَنَّھَا لَا تَدْخُلُھَا وَھِیَ عَجُوْزٌ' اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ اِنَّا اَنْشَاْنٰھُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰھُنَّ اَبْکَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا)) (۶)

"حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں ایک بوڑھی عورت حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! (ﷺ) میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو جنت نصیب کرے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی"۔ وہ عورت روتی ہوئی لوٹنے لگی۔ آپؐ نے فرمایا کہ "اس سے کہہ دو کہ بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی' مگر جوان ہو کر۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق کہ ﴿ اِنَّا اَنْشَاْنٰھُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰھُنَّ اَبْکَارًا ﴾ "ہم نے ان عورتوں کو خاص طور پر بنایا' یعنی ہم نے ان کو ایسا بنایا کہ وہ کنواریاں ہیں"۔

ہمارے لئے نبی کریم ﷺ کی سیرت اُسوہ ہے اور آپؐ کے عمل سے ہمیں ایک خاص معیار اپنے سامنے رکھنا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی مجالس میں گو وقار' سنجیدگی اور متانت کی فضا ہر وقت قائم رہتی' یہاں تک کہ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضور ﷺ کی صحبت بابرکت میں ایسے باادب و باتمکین ہو کر بیٹھتے کہ گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ ادنیٰ سی حرکت سے اڑ جائیں گے' مگر پھر بھی آنحضرت ﷺ کی خوش طبعی کی جھلک ان متبرک صحبتوں کو خوشگوار بناتی رہتی کیونکہ آنحضرت ﷺ اگر ایک طرف نبی مرسل کی حیثیت سے احترام رسالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے وعظ و تلقین میں مصروف رہتے تو آپؐ دوسری طرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ایک بے تکلف دوست اور ایک خوش مزاج ساتھی کی حیثیت سے بھی میل جول رکھتے۔ اگر زیادہ اوقات میں آپؐ کی مجلس ایک دینی درسگاہ اور تعلیمی ادارہ بنی رہتی تو کچھ دیر کے لئے خوش طبع مہذب

دوستوں کی بیٹھک بھی بن جاتی جس میں ظرافت کی باتیں بھی ہوتیں اور گھر بار کے روزانہ کے قصے بھی بیان ہوتے۔ غرض بے تکلفی سے آپؐ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں گفتگو کرتے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ظرافت کس طرح کی تھی؟ آپ ﷺ کی ظرافت کی تعریف آپؐ ہی کی زبان مبارک سے سن لیجئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے تعجب سے پوچھا کہ آپؐ بھی مذاق کرتے ہیں؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا :

"ہاں بیشک! میرا مزاح سراسر سچائی اور حق ہے"۔ (۷)

اس کے مقابلہ میں ہمارا آج کل کا مزاح وہ ہے جس میں جھوٹ، غیبت، بہتان، طعن و تشنیع، دوسرے کی تذلیلِ نفس، تحقیر اور بیجا مبالغوں سے پورا پورا کام لیا گیا ہو۔

حواشی

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲۰، پنجاب یونیورسٹی لاہور

(۲ *Franz Humour in early Islam : Rosenthal*

(۳ *Critiqeu of Judgment : Kant. P.223*

(۴) شمائل ترمذی، باب ماجاء فی صفۃ مزاح رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

(۵) مصباح اللغات میں نُغیر کا معنی بلبل یا چڑیا کے بچے کے ہیں۔ جبکہ صاحب مختار الصحاح، شیخ محمد بن بکر بن عبدالقادر رازی نے لکھا ہے کہ : وَھی طیر کالعصافیر یعنی یہ چڑیا کے بچے کی طرح کا پرندہ ہے۔ بعض علماء اس کا ترجمہ لال سے کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس بچہ کو کنیت سے تعبیر فرمایا۔ اس نے ایک جانور پال رکھا تھا وہ مرگیا تھا جس کی وجہ سے یہ رنجیدہ بیٹھا ہوا تھا، حضور اقدس ﷺ نے اس کو چھیڑنے کے لئے پوچھا کہ وہ نغیر کیا ہوا؟ حالانکہ حضور اقدس ﷺ کو معلوم تھا کہ وہ مرگیا تھا۔

(۶) شمائل ترمذی، باب ماجاء فی صفۃ مزاح رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

(۷) شمائل ترمذی، باب ماجاء فی صفۃ مزاح رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

ماہنامہ القاسم کا خصوصی نمبر

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ کی یاد میں

ترتیب وتدوین کے مراحل میں' اکابر کی تحریروں کا وقیع مجموعہ'

ایک عظیم تاریخی دستاویز' اکابر علمائے ہند کے رشحاتِ قلم'

بعض لکھنے والے اکابر علماء اور مشائخ کے اسمائے گرامی

✵ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ✵ مولانا ابوالکلام آزادؒ ✵ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ ✵ مولانا محمد منظور نعمانیؒ ✵ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ✵ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ ✵ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ ✵ شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ ✵ علامہ انور شاہ کشمیریؒ ✵ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ ✵ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ ✵ مولانا حفظ الرحمٰن سہارنپوریؒ ✵ مولانا اعزاز علی شیخ الادبؒ ✵ مولانا سید اظہر شاہ قیصرؒ ✵ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ ✵ مولانا مفتی سید مہدی حسنؒ ✵ قائد ملت مولانا مفتی محمودؒ ✵ قائد شریعت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ ✵ مولانا اخلاق حسین قاسمیؒ ✵ مولانا نسیم احمد فریدیؒ ✵ مولانا سید محمد میاں صاحبؒ ✵ مولانا سید سلیمان ندویؒ ✵ مفتی مرغوب احمد لاجپوریؒ

القاسم کے سالانہ خریدار بنئے اور خصوصی نمبر مفت حاصل کیجئے

برائے رابطہ :

ماہنامہ القاسم خالق آباد جامعہ ابوہریرہؓ پوسٹ آفس برانچ نوشہرہ

فون وفیکس : 630237 - 630611 - 0923

۱۰) یورپ اور بھارت کی ثقافتی یلغار کا راستہ نہ روکا جائے۔

بالفاظ دیگر ہم اگر مذکورہ بالا ایجنڈے پر عمل پیرا ہو کر امریکہ کو خوش کرنے کی راہ اختیار کریں گے تو صرف اسی صورت میں وہ ہمیں زندہ رہنے کا حق دیتے ہوئے ہماری امداد جاری رکھیں گے۔ بصورت دیگر ہماری معیشت جو پہلے ہی دم توڑ چکی ہے' ہمارے لئے سوہان روح بن جائے گی۔ بہرکیف امریکی ایجنڈے کو تسلیم کر لینے کا مطلب بھارت کو علاقائی سپرپاور ماننے اور عالمی مالیاتی اداروں کے مطالبات پورے کرنے کے لئے اپنے عوام کا خون نچوڑنے کے مترادف ہو گا۔

تاریخ کے اس نازک ترین مقام پر پاکستان کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ امریکہ اور بھارت کے مفادات کو پورا کرتے ہوئے ذلت کا راستہ اختیار کرتا ہے یا اپنی نظریاتی اساس یعنی اسلام سے تعلق مضبوط کر کے باعزت راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ

۱) ہم اپنی نظریاتی اساس سے تعلق مضبوط کریں۔

۲) دنیا میں تنہا رہ جانے کے خوف کا شکار ہونے کے بجائے خالق کائنات اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط کیا جائے۔

۳) شریعت اسلامی کے نفاذ کے عمل کو تیزی سے بروئے کار لایا جائے۔ حکومت کو اس معاملے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات سے فائدہ اٹھانا چاہئے جس پر تحقیق اور محنت کا کثیر سرمایہ صرف ہوا ہے۔

۴) اندرونی اور بیرونی سود کا فوری خاتمہ کیا جائے کہ اس کے بغیر ہماری معیشت کے سدھرنے کا کوئی امکان نہیں۔

۵) چین کی جانب سے دوستی اور تعاون کی پیشکش کو غنیمت سمجھتے ہوئے قبول کرنا چاہئے۔

۶) طالبان کے ساتھ مکمل یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کنفیڈریشن کی طرف پیش رفت کرنی چاہئے۔

اگرچہ دوسرا راستہ مشکل ہے لیکن اس راستے پر چلنے سے اللہ کی مدد یقینی طور پر ہمارے ساتھ ہو گی جس کے نتیجے میں اس راستے کی تمام مشکلیں بتدریج آسان ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حکمرانوں کو اس راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے"۔

May 2000 Reg. No. CPL. 126

MONTHLY Vol. 19

Hikmat-e-Quran

LAHORE No.5

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ